Islam & Interest by Muhammad Shafi Aga

کا اردو ترجمہ

از

رانا محمد عاشق، آئی ٹین ٹو اسلام آباد، پاکستان

مندرجات

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پیش لفظ

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں الربا کو حرام قرار دیا ہے لیکن اس الربا سے مراد کیا ہے اس پر اتنا غور نہیں کیا گیا حالانکہ قرآن پاک اور احادیث مبارکہ میں مکمل طور پر اس کی وضاحت کر دی گئی ہے لیکن اس وضاحت کے باوجود ہمارے تقریباً سارے ہی موجودہ دور کے علماء کرام، محققین اور مفسرین نے الربا کا ترجمہ سود (Interest) یا زیادہ سے زیادہ بھاری سود (Usury) کیا ہے جو نہ تو لغوی طور پر ٹھیک ہے اور نہ ہی قرآنی تعریف اور احادیث مبارکہ کی روشنی میں درست۔ الربا کا مادہ (Root) ربو (ر۔ب۔و) ہے جس کے لغوی معنی بڑھنے (To grow) یا اضافہ ہونے (To increase) کے ہوتے ہیں۔ اس سے اسم ربا نکلا ہے جس کے معنی بڑھوتری یا ترقی یا نشو و نما (Growth) یا اضافہ (Increase or Gain) کے بنتے ہیں اور سیاق و سباق سے یہ بات معلوم ہے کہ قرآن کی اس بڑھوتری سے مراد حیاتیاتی (Biological) یا کسی اور قسم کی بڑھوتری نہیں ہے بلکہ اس بڑھوتری سے مال و دولت میں بڑھوتری (Growth) مراد ہے۔ اب مال و دولت میں ہر قسم کی بڑھوتری کو تو قرآن منع نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اگر ہر قسم کی مالی بڑھوتری یا ترقی منع کر دی جاتی تو انسان کی معاشی تگ و دو اور سرگرمی کے تمام شعبے ترقی کے لئے بند ہو جاتے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ انسان ہر قسم کی معاشی تگ و دو کو چھوڑ دے اور جو کچھ اس کو قدرت کی طرف سے مفت میں دستیاب ہو اس پر ہی اکتفا کرے۔ ایسا تو اسلام اور قرآن کی روح کے منافی ہوتا۔ پس اس کا مطلب تو پھر یقیناً یہ بنتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی مالی بڑھوتری سے منع نہیں فرمایا بلکہ وہ کوئی خاص قسم کی بڑھوتری ہی ہو گی جس سے منع فرمایا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جس مالی بڑھوتری سے منع فرمایا ہے اس کو قرآن پاک میں ربا سے پہلے ال لگا کر مخصوص کر دیا گیا ہے اور وہ ہے الربا۔ اللہ تعالیٰ نے سورہ الروم کی آیت نمبر 39 میں اسی الربا کی تعریف (Definition) یوں بیان کی ہے کہ "وَمَآ اٰتَیۡتُمۡ مِّنۡ رِّبًا لِّیَرۡبُوَا۠ فِیۡۤ اَمۡوَالِ النَّاسِ "وہ جو تم دیتے ہو بڑھنے کے واسطے کہ بڑھے وہ لوگوں کے اموال میں۔ یعنی جب تم اموال (اشیاء و خدمات کی صورت میں) لوگوں کو اس لئے دیتے (بیچتے یا فراہم کرتے) ہو تا کہ لوگوں کے جائز اموال میں سے اپنے اموال میں اضافہ کر و تو یہ اضافہ یا بڑھوتری حرام اور منع ہے۔ گویا الربا وہ مالی بڑھوتری ہے جو خود کما کر نہیں بلکہ دوسرے لوگوں کے اموال سے حاصل کی جائے۔ اس کی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ ایک شخص یا چند اشخاص چور بازاری کر کے یا اشیاء کا سٹاک کر کے بازار میں اپنی اجارہ داری

قائم کر لیتے ہیں اور پھر قیمت بڑھا کر صارفین کو لوٹتے ہیں اور ان کی جیبوں سے ان کے جائز اموال نکلوا کر اپنے منافعوں میں ناجائز طور پر اضافہ کرتے ہیں۔ اس صورت میں ان کے یہ ناجائز منافع جات الربا کے زمرے میں آئیں گے۔ یا اس کی مثال یوں لے لیجئے کہ ایک کاشتکار کی فصل میں کیڑا لگ چکا ہے اگر ایک یا دو دن میں اس پر کیڑے مار ادویات کا سپرے نہیں کیا گیا تو ساری فصل تباہ و برباد ہو جائے گی لیکن کیڑے مار ادویات خریدنے کے لئے اس کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ اس صورت حال میں وہ ایک ادویہ فروش دوکاندار کے پاس جاتا ہے اور اسے کہتا ہے کہ مجھے فلاں فلاں کیڑے مار ادویات ادھار دے دو۔ ایک دو ماہ میں فصل پک کر تیار ہو جائے گی تو اسے بیچ کر میں تمہاری ادائیگی کر دوں گا۔ اب دوکان دار اس کاشتکار کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتا ہے اور سو کی دوائی اس کو دو سو میں فروخت کر دیتا ہے۔ یہ سو فی صد منافع اس دوکان دار کا حق نہیں ہے بلکہ وہ کاشتکار کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اپنا منافع کاشت کار کے مال میں سے وصول کر رہا ہے۔ جائز منافع وصول کرنا دوکاندار کا حق تھا لیکن اس حق سے زیادہ وصول کر کے وہ الربا لینے کا مرتکب ہو رہا ہے۔

الربا کی مثال محنت کے شعبہ سے بھی دی جا سکتی ہے۔ ایک مزدور یا ملازم اپنی محنت ایک کاروبار کو فراہم کرتا ہے لیکن مزدوری یا تنخواہ پوری وصول کرنے کے باوجود وہ مطلوبہ حد تک اس کام میں اپنی محنت صرف نہیں کرتا جس کے لئے اسے ملازم رکھا گیا تھا۔ اس صورت میں وہ الربا لینے کا مرتکب ہو رہا ہے کیونکہ کام کو مطلوبہ حد تک سرانجام نہ دے کر وہ اپنے مال میں اضافہ، اپنے مالک کے جائز مال میں سے کر رہا ہے۔ دوسری طرف اگر ملازم رکھنے والا مالک کام تو پورا لیتا ہے لیکن اجرت یا تنخواہ پوری ادا نہیں کرتا تو اس صورت میں مالک اپنے مال میں اضافہ مزدور یا ملازم کی اجرت یا تنخواہ (جو ان کا مال ہے) میں سے نکال رہا ہے اسلئے وہ الربا لینے نے کا مرتکب ہو رہا ہے۔ اسی طرح ایک زمیندار اگر اپنے مزارع سے زمین کاشت کرنے کے کا لگان اتنا زیادہ وصول کرتا ہے کہ غریب مزارع کی محنت بھی پوری نہیں ہوتی تو وہ زمیندار اس مزارع کی محنت میں سے اپنے مال میں اضافہ کر کے الربا لینے کا مرتکب ہو رہا ہے۔

اب فرض کریں کہ بازار میں بینکوں سے قرضہ دس فی صد سالانہ شرح سے عام دستیاب ہے۔ لیکن ایک آدمی کے پاس بینکوں کو مطمئن کرنے کے لئے مناسب گارنٹی موجود نہیں ہے۔ وہ ایک ساہوکار کے پاس چلا جاتا ہے اور وہاں سے پچاس فی صد سالانہ کے حساب سے قرضہ حاصل کرتا ہے۔ اس صورت میں چالیس فی صد زیادہ شرح جو اس ساہوکار نے وصول کی وہ اصل میں اس قرضہ لینے والے کا مال ہے جو ساہوکار نے وصول کر کے اپنے مال میں اضافہ کیا اس لحاظ سے یہ زائد شرح الربا کہلائے گی۔

آگے چلنے سے پہلے ذرا احادیث مبارکہ پر بھی نظر ڈال لیتے ہیں۔ اوپر بیان کردہ مالی لین دین کی مثالوں میں دوسروں کے اموال سے غیر منصفانہ اور غاصبانہ وصولی کو الربا کہا گیا ہے۔ بہت ساری احادیث (جن کو احادیث کے ابواب میں بیان کیا گیا ہے) اس بات کی تصدیق کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک ہی شے کی مختلف کوالٹیوں کو باہم یا مختلف اشیاء کو آپس میں بارٹر سسٹم کے ذریعے تبدیل کرنا منع کیا گیا ہے اور حکم دیا گیا ہے کہ اگر ایسا ہی کرنا ہو تو پہلے ایک کوالٹی یا ایک شے کو بازار میں قیمت کے عوض بیچو اور پھر اس رقم سے دوسری کوالٹی یا شے کو بازار سے خریدلو۔ یہ حکم اس لئے دیا گیا تاکہ بارٹر سسٹم کے تحت اشیاء کے باہمی تبادلے میں کسی کے ساتھ مالی بے انصافی اور ظلم نہ ہو جائے۔ اس قسم کی مالی بے انصافی اور ظلم کو احادیث مبارکہ میں واضح طور پر الربا سے موسوم کیا گیا ہے۔ اسی قسم کی مالی بے انصافی، یوژری (Usury) کے سلسلہ میں بھی ہوتی ہے جو دور رسالت میں عرب کے اندر عام تھی۔ پس یوژری (Usury) کو بھی الربا میں شامل کیا جاتا ہے۔ البتہ تجارتی یا بینکاری سود (جس کا تعین مارکیٹ کرتی ہے) کا وجود حضور ﷺ کے زمانے میں تھا ہی نہیں اور نہ اس ضمن میں کوئی حدیث ہمیں مل سکتی ہے۔

معاشیات میں بنیادی عاملین پیدائش چار ہیں۔ زمین، محنت، سرمایہ اور تنظیم۔ زمین کے استعمال کا معاوضہ لگان، محنت کا معاوضہ اجرت یا تنخواہ، سرمائے کا معاوضہ سود اور تنظیم کا معاوضہ منافع ہوتا ہے۔ قرآن کی رو سے یہ معاوضے منصفانہ ہونے چاہئیں اور معاشیات کی رو سے یہ معاوضے اسی وقت منصفانہ ہونگے جب ان کا تعین مکمل مقابلے کے تحت عمل میں آئے گا۔ اگر کہیں پر کسی کی اجارہ داری قائم ہو گی ان کے معاوضے ان کی منصفانہ سطح سے یا تو زیادہ ہو جائیں گے یا کم اور دونوں صورتوں میں الربا کا عنصر شامل ہو جائے گا۔ اس لئے اسلام نے کاروبار پر کوئی پابندی نہیں لگائی سوائے اس کے کہ اسے آزاد اور مکمل مقابلے کے تحت چلایا جائے تاکہ ہر شے کی ایک منصفانہ قیمت مقرر ہو اور تمام عاملین پیدائش کے معاوضے ایک مناسب سطح پر رہیں۔ جب بھی کہیں اجارہ داری قائم ہو گی تو یہ معاوضے مناسب سطح سے کم یا زیادہ ہو جائیں گے اور الربا کا عنصر ان میں کہیں نہ کہیں سے شامل ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے ہر ملک میں اجاداری مخالف قوانین (Anti-Monopolistic Rules) بنائے جاتے ہیں تاکہ کسی شعبہ میں اجارہ داری قائم نہ ہونے پائے۔ اور اگر کسی شعبہ میں اجارہ داری قائم کرنا ناگزیر ہو تو وہ شعبہ حکومت کی نگرانی میں کام کرتا ہے تاکہ صارفین کو اجارہ دار کے استحصال سے بچایا جاسکے۔

اب ہمارے علماء کرام اور محققین و مفسرین حضرات کی نگاہیں اصل نقطہ پر نہیں گئیں کہ چور بازاری یا اشیاء کا سٹاک کرکے، اجرتوں میں کمی یا مزدوروں سے کام زیادہ لے کر اور مزاعین کا خون نچوڑ کر یا ان کے بچوں کو بھوکا مار کر اپنے منافع جات بڑھانے کا نام الربا ہے۔ اگر ان کی نگاہ کہیں پر جا کر رکی ہے تو صرف سود پر۔ سود کا مطلب تو فائدہ ہی ہوتا ہے تو نفع بھی تو فائدہ ہی ہے پھر نفع کیوں

حلال ہے اور وہ بھی (ان کے مطابق) بغیر کسی حد و حساب کے چاہے دو گنا چو گنا کیوں نہ ہو اور سود کیوں حرام ہے چاہے ہزار پر ایک پیسہ یا اس سے بھی کم کیوں نہ ہو۔

اس بارے میں دلیل یہ دی جاتی ہے کہ سود کی شرح متعین (Fixed) ہوتی ہے اور منافع متغیر (Variable)، گویا حلال حرام کی کسوٹی متعین اور متغیر ہونا ٹھہری۔ اگر سارے متعین معاوضے حرام ہیں تو مکانوں کے کرایے، زمینوں کے لگان، اور ملازمین و مزدوروں کے معاوضے جو متعین ہوتے ہیں وہ کیوں حلال ہیں؟ غرض اس منطق کا نہ کوئی جواز ہے اور نہ کوئی ثبوت۔ اور جب ان سے یہ کہا جاتا ہے آج کے دور میں حقیقی اور اصلی سود (Real Interest) بھی متعین نہیں ہے۔ جو چیز متعین ہے وہ دراصل عرفی یا فرضی (Nominal Interest) ہے جس کو افراط زر (Inflation Rate) کی شرح متغیر بنا دیتی ہے اور اکثر صورتوں میں (جب افراط زر کی شرح عرفی یا فرضی سود کی شرح سے زیادہ ہو جائے) حقیقی اور اصلی شرح سود منفی ہو جاتی ہے۔ تو یہ بات یا تو ان کی سمجھ میں نہیں آتی یا پھر خود تجاہل عارفانہ سے کام لے کر سمجھنا نہیں چاہتے۔

ایک دلیل سود کے خلاف یہ بھی دی جاتی ہے کہ چونکہ سرمایہ برائے خود مال و دولت (اشیاء و خدمات) پیدا نہیں کر سکتا اس لئے اس کا معاوضہ علیحدہ سے ادا نہیں کیا جا سکتا۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو کوئی بھی عامل پیدائش چاہے زمین ہو یا محنت یا تنظیم برائے خود مال و دولت پیدا نہیں کر سکتا۔ کسی بھی کاروبار میں ان عاملین پیدائش کو اکٹھا مل کر ہی کام کرنا پڑتا ہے۔ اس صورت حال میں پھر سرمایے کی تخصیص کیوں کی جائے۔ اگر باقی عاملین پیدائش کے معاوضے ان کی اپنی اپنی طلب و رسد کے باہمی توازن کی بنیاد پر مقرر ہو سکتے ہیں تو پھر سرمایے کا معاوضہ اس کی اپنی طلب و رسد کے توازن کی بنیاد پر کیوں نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن اس کے باوجود بھی اصرار ہے کہ جناب سود حرام ہے۔

چلیں مان لیتے ہیں کہ سود حرام ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کو حلال کیسے کیا جائے کیونکہ سرمایے کی فراہمی کے بغیر کوئی کام چلتا نہیں اور سرمایہ کی فراہمی بغیر سود کے ممکن نہیں ہے۔ اس کا حل پیش کیا گیا کہ سود کو متغیر بنا لیا جائے اور اس کو محنت کے ساتھ شامل کر لیا جائے (حالاں کہ ہر کاروبار میں سرمایہ محنت کے ساتھ شامل ہی ہوتا ہے)۔ اس لئے بینک اور دوسرے مالیاتی اداروں کو اسلامی بنانے کے لئے ضروری ہوا کہ وہ اپنے قرض داروں سے **مشارکہ** اور **مضاربہ** کی بنیاد پر معاملات طے کریں۔ **مشارکہ** اور **مضاربہ** شاید ایک چھوٹی سطح پر یا پھر ایک آدھ کاروبار کے لئے تو ممکن ہوتے لیکن بینکوں کے لئے اپنے سارے فنڈز ان مدوں میں لگا دینے میں خطرات ہی خطرات تھے اور ہر قرضدار سے یہ معاملات طے کرنا بینکوں کا خودکشی کرنے کے مترادف تھا (وضاحت ضمیمہ ج میں ملاحظہ فرمائیں)۔ یہاں سے ناکامی کے بعد رخ **مرابحہ** کی جانب ہوا کہ بینک بازار میں دستیاب بہترین کو الٹی

کی اشیاء مسابقتی قیمتوں پر خریدیں اور پھر اسے وہ اپنے گاہکوں کو ان کی دہلیز پر مہیا کر دیں۔ لیکن ایسا کرنے کے لئے بینکوں کے پاس مناسب بنیادی ڈھانچہ موجود ہونا چاہیئے جو کہ نہیں ہے اور نہ ہی ہو سکتا ہے۔ اس لئے ان سے اس کی توقع رکھنا بھی ایک امر محال ہے۔

موجودہ دور میں سرمایے کی فراہمی کا ایک طریقہ مالیاتی منڈیوں (Financial Markets) یعنی سٹاک ایکس چینج وغیرہ کی صورت میں بھی وجود میں آیا ہے جہاں پر منافع تو متغیر ہو جاتا ہے مگر مالیات کی فراہمی کے اس طریقہ میں بڑی سلیقہ مندی کے ساتھ دھوکہ دہی اور جوئے کے عنصر کو شامل کر دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے اس طرح سرمایہ کاری کرنے میں بے شمار خطرات مول لینے پڑتے ہیں جن کے بینک متحمل نہیں ہو سکتے۔ کسی بھی بینک کے لئے اپنے سارے فنڈز سٹاک ایکس چینج میں لگانا اس کی تباہی اور بربادی پر منتج ہونا یقینی امر ہوتا ہے۔

پھر مالیات کی فراہمی کا حل 'بیع معجل' میں نکالا گیا۔ اس طریقہ کے مطابق شے یا جائداد جو بھی گاہک کو چاہیئے ہوتی ہے اس کو بینک خرید لیتا ہے اور پھر زیادہ قیمت پر ادھار قسطوں میں وہ گاہک کو بیچ دی جاتی ہے۔ اس طریقے سے دو قیمتی نظام وجود میں آجاتا ہے، ایک قیمت ادھار کے لئے اور دوسری قیمت نقد کے لئے۔ ایک روائتی بینک اپنے گاہک کو شے یا جائداد کی بجائے نقد رقم دیتا ہے اور اس پر سود وصول کرتا ہے۔ لیکن بیع معجل کی صورت میں گاہک سود کی بجائے نقد اور ادھار قیمت کا فرق ادا کرتا ہے۔ اس (گاہک) کے لئے تو یہ صرف نام (Nomenclature) کا ہی فرق ہے۔ پس اس معاملے کی تلخ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی بینک بھی زائد رقم وصول کرتے ہیں مگر اس کو وہ سود نہیں کہتے بلکہ مارک اپ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ پیچیدہ راستہ انہوں نے صرف اس لئے اختیار کیا ہے کہ ان پر سود خوری کا الزام نہ لگ سکے جس کو غلطی سے الربا کے مترادف سمجھ لیا گیا ہے جو اسلام میں حرام ہے۔ بیع معجل کے حوالے سے اسلامی بینکوں کو ایک دعویٰ اکثر کرتے ہوئے سنا گیا ہے کہ حریف روائتی بینکوں کے مقابلہ میں ان کو منافع زیادہ حاصل ہوتا ہے۔ اس کا مطلب تو یہی بنتا ہے کہ جو قیمت کا فرق اول الذکر بینک وصول کرتے ہیں وہ شرح میں اس سود سے زیادہ ہے جو موخر الذکر بینک وصول کرتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ ایسا اس لئے ممکن ہوتا ہو کہ اول الذکر اپنے قرض داروں کے جائز اموال ہڑپ کر کے اپنے حق سے زیادہ وصول کر رہے ہوں۔ اور اس طرح اسی گناہ میں مبتلا ہو رہے ہوں جس سے پیچھا چھڑانے کے لئے انہوں نے یہ پاپڑ بیلے تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی پرواہ کس کو ہے کہ حلال کیا ہے اور حرام کیا ہے بس اسلام کا ٹھپہ لگا ہونا ضروری ہے۔

ایک اور بات کا تذکرہ یہاں پر ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ روائتی بینکاری سسٹم میں شفافیت کا عنصر نمایاں ہوتا ہے۔ مختلف بینکوں کی مقرر کردہ سود کی مختلف شرحوں سے ایک عام آدمی اس بات کا بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے کہ اسے کہاں سے قرضہ سستا مل سکتا ہے اور کہاں سے مہنگا۔ مگر دو قیمتی نظام کے تحت جو آج کل اسلامی بینکاری کی بنیاد بنا ہوا ہے اس قسم کا تقابل ممکن ہی نہیں ہوتا اور قرضے کی فراہمی کا نظام نہایت ہی غیر شفاف ہو جاتا ہے۔

اسلامی بینک مالیات کی فراہمی کے اجارہ (قسط وار خریداری) اور بیع سلم (ادھار پر خریداری) جیسے دوسرے طریقے بھی اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ایسے تمام طریقوں کی وجہ جواز ایک ہی ہے اور وہ ہے سود سے (صرف نام کی حد تک) چھٹکارا۔ اسلامی بینک جب اس طرح کے مختلف طریقے اختیار کرتے ہیں، تو وہ اس بات سے بے خبر ہوتے ہیں کہ الربا کے قرآنی حکم نے اس فرق کے لینے پر ایک حد مقرر کر دی ہے جو دو قیمتوں (یعنی نقد اور ادھار) میں ہوتا ہے۔ اگر وہ اس سلسلے میں اپنے جائز اموال کی حدود سے باہر جا کر اپنے قرض داروں کے اموال کو ہڑپ کرنا شروع کر دیں گے تو وہ اپنے آپ کو حرام اور ممنوعہ الربا میں ملوث ہونے کا مجرم بنا لیں گے۔ اور تب اگر ایسے اسلامی بینک ان روائتی بینکوں پر جو اپنے اموال کی حدود کے اندر رہتے ہوئے سود وصول کرتے ہیں، الربا میں ملوث ہونے کا الزام لگائیں گے تو معاملہ "الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے" والا ہو گا۔ ایسی صورت میں اسلامی بینک ان لوگوں کی مانند ہونگے جن کو شیطان نے چھو کر خبطی کر دیا ہے اور خود تو الربا کھاتے ہیں اور دوسروں کو کہتے ہیں کہ سود پر مبنی (بینکنگ کا) کاروبار الربا کی مانند ہے۔ "اَلَّذِیۡنَ یَاۡکُلُوۡنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوۡمُوۡنَ اِلَّا کَمَا یَقُوۡمُ الَّذِیۡ یَتَخَبَّطُہُ الشَّیۡطٰنُ مِنَ الۡمَسِّ ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ قَالُوۡۤا اِنَّمَا الۡبَیۡعُ مِثۡلُ الرِّبٰوا" اللہ ہم سب کو شیطان کے اثر سے بچائے۔

علامہ تمنا عمادی مرحوم نے فرمایا تھا کہ ہمارے تمام مسائل "مشمولہ سود" کا حل قرآن پاک کی آیات میں غور کرنے سے نکلے گا۔ اس لئے انہوں نے تجویز کیا تھا کہ روایات کی روشنی میں قرآنی آیات کی تشریح و توضیح کرنے کی بجائے پہلے قرآن پاک کی آیات پر ان کے سیاق سباق کے لحاظ خوب غور کیا جائے اور پھر جو حل نظر آئے اس کی روشنی میں احادیث مبارکہ کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ جناب محمد شفیع آغا نے الربا کی تعریف قرآنی آیات سے اخذ کر کے یہ کام کر دکھایا ہے اور پھر اس تعریف کی روشنی میں انہوں اس بارے احادیث کے ذخیرے کو کھنگالا ہے۔ اس طرح سے انہوں نے احادیث مبارکہ کے جو مفاہیم متعین کئے ہیں وہ آسانی سے سمجھ میں آنے والے ہیں۔ وہ احادیث مبارکہ پہلے بھی کئی بار نظر سے گذر چکی تھیں لیکن ان سے الربا کے معاملے میں ذہن صاف نہیں ہوا تھا بلکہ کچھ اور الجھ گیا تھا۔ جناب محمد شفیع آغا نے بڑے عام فہم مگر نہایت عالمانہ انداز میں اپنی انگریزی کتاب Islam and Interest میں الربا کی قرآنی تعریف اور اس سے متعلقہ احادیث کو بیان کیا ہے جس کا اردو ترجمہ حاضر خدمت ہے۔ اس سلسلے میں کتاب کے مصنف محمد شفیع آغا سے ضروری اجازت حاصل کر لی گئی ہے۔ گو کہ ترجمہ اصل کتاب کا متبادل تو نہیں

ہو سکتا لیکن اگر اس ترجمہ کو پڑھنے سے پہلے اپنے ذہن کو ان سارے تعصبات اور غلط فہمیوں سے پاک کر لیا جائے جو سود اور الربا کے بارے میں ہمارے ذہنوں میں پائے جاتے ہیں تو انشاءاللہ موضوع کو سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔ وہ تعصبات اور غلط فہمیاں عموماً اس قسم کی ہیں: سود ہی الربا ہے اس لئے سود حرام ہے اور سود کا کاروبار کرنے والے سارے بینک حرام کا کاروبار کرتے ہیں اور اسی بنا پر بینک کی ملازمت کرنا بھی حرام ہے۔ اسلام نے منافع پر کوئی حد نہیں رکھی اس لئے جتنا مرضی چاہے منافع لیا جائے سب حلال ہے اور اس پر الربا کا اطلاق نہیں ہوتا وغیرہ وغیرہ۔

جناب محمد شفیع آغا نے الربا کی جو تعریف قرآن سے اخذ کی ہے وہ بالکل درست معلوم ہوتی ہے اور اس سے مزید جو نتائج اخذ ہوتے ہیں وہ یہ ہیں:

- الربا کو ختم کرنے کی ذمہ داری سب سے پہلے تو خود افراد پر عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنی زندگیوں سے الربا کو ختم کریں۔ کیا کسی دفتر یا کارخانے میں کام کرنے والے ملازم یا مزدور کو ایمان داری سے کام کرنے کے لئے کسی اور کی مدد کی ضرورت ہے؟ اگر وہ ایمانداری سے وہ کام سرانجام نہیں دے رہا جس کا اسے معاوضہ دیا جارہا ہے تو وہ الربا لینے کا مرتکب ہو رہا ہے۔ اس کا شاید ہم میں سے کسی کو احساس تک بھی نہیں ہے۔

- ہمارے تمام کاروباری حلقوں کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ اپنے منافع جات کے لئے جائز حدود کا تعین الربا کی قرآنی تعریف کو مدنظر رکھتے ہوئے کریں۔ وہ اس بات کا ضرور خیال کریں کہ اللہ نے اگر کاروبار کو حلال کیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہو گیا کہ چاہے جتنا مرضی منافع لے لو سب جائز ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ اللہ نے اگر کاروبار کو حلال کیا ہے تو الربا کو حرام بھی کیا ہے۔ اور اگر ناجائز منافع خوری الربا کی حدود میں داخل ہو گئی تو سارا کاروبار بھی حرام ہو جائے گا۔

- ہمارے علمائے کرام کی بھی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ لوگوں کو دو قیمتی نظام جیسی حیلہ سازیوں میں مبتلا کرنے کی بجائے الربا کی قرآنی تعریف سے ان کو آگاہی فراہم کریں۔ یہ بات ہمیں اچھی طرح سے سمجھ لینی چاہیئے کہ حیلہ سازی کے ذریعے ہم لوگوں کو دھوکہ دینے میں تو کامیاب ہو سکتے ہیں مگر اس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کو دھوکہ نہیں دیا جاسکتا۔ اس لئے حیلہ سازی کی اسلام میں قطعًا اجازت نہیں ہے۔

- جہاں تک حکومت اور اس کے متعلقہ اداروں (سٹیٹ بنک وغیرہ) کی ذمہ داری کا معاملہ ہے وہ یہ نہیں ہے کہ وہ ان بینکوں کو جو مالیات کی فراہمی جائز اور قانونی طریقے سے اپنے منافع جات کو ایک جائز حد کے اندر رکھتے ہوئے کر رہے ہیں ان پر

کچھ ناروا قسم کی پابندیاں عائد کر دے۔ بلکہ ان کا فرض تو یہ بنتا ہے کہ جو بینک ناجائز منافع حاصل کرنے کی غرض سے زیادہ شرح سود وصول کر کے اپنے گاہکوں کا استحصال کر رہے ہیں اور الربا لینے کے مرتکب ہو رہے ہیں ان پر پابندیاں لگائی جائیں۔

- حکومت الربا کی قرآنی تعریف کی روشنی میں وفاقی عدالت عالیہ پاکستان(Supreme Court of Pakistan)کے 2010 کے سود کے بارے میں دیے گئے فیصلے کے خلاف نظر ثانی کی اپیل کرے۔
- تمام بینک اس کتاب میں دیے گئے ماڈل اسلامی بینک کی طرز پر کام کریں۔ نہ وہ اپنے ملازمین کا استحصال کریں اور نہ اپنے گاہکوں کا، اور وہ اپنے منافع جات کا تعین کرتے وقت الربا کی قرآنی تعریف کو ضرور بضرور مد نظر رکھیں کہ کہیں ان کے منافع جات الربا کے زمرے میں تو نہیں آ رہے۔

رانا محمد عاشق

اسلام آباد

24جون2017

دیباچہ

اشاعت اول

میں اپنی ذہنی بلوغت کے شروع دنوں سے ہی اس بات پر پریشان رہتا تھا کہ بینک یا اداراتی سود (Institutional Interest) تمام مسلمانوں میں متفقہ طور پر حرام تصور کیا جاتا ہے لیکن پھر بھی وہ بڑے دھڑلے کے ساتھ بغیر کسی ظاہری احساس گناہ کے سود پر مبنی لین دین کرتے ہیں۔ بہت ہی کم مسلمان ایسے ہونگے جو اس سے مکمل طور پر اجتناب برتتے ہونگے۔ یہ سوچ کر میری پریشانی اور بھی بڑھ جاتی کہ کیا اس لحاظ سے مسلمانوں کی اکثریت منافق تو نہیں ہے؟ یا پھر اگر وہ یہ لین دین کرنے پر مجبور ہیں تو اللہ نے ایسا حکم دیا ہی کیوں جو نا قابل عمل ہے جبکہ اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں کہ "لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَهَا"[1]۔ میں نے اپنی اس پریشانی کا حل ڈھونڈنے کے لئے قرآن پاک کے بہت سارے انگریزی اور اردو تراجم پڑھ ڈالے مگر میری بے چینی کسی طرح بھی ختم ہونے میں نہیں آرہی تھی۔ تمام تراجم ربا کا ترجمہ سود (Interest) یا زیادہ سے زیادہ یوژری (Usury) ہی کر رہے تھے۔ یہ بات مجھ پر بہت بعد میں منکشف ہوئی کہ ہو سکتا ہے کہ ربا کا تصور بطور سود بلکہ بطور یوژری بھی جو ہمارے ذہنوں میں ہے وہ صحیح ہی نہ ہو۔ ابتدا میں یہ خیال کچھ مبہم سا تھا لیکن بعد میں جوں جوں میں قرآن میں موجود ربا کے بارے آیات کو پڑھتا اور ان پر غور کرتا گیا یہ خیال واضح ہوتا چلا گیا۔ اب جا کر میں اس قابل ہو گیا ہوں کہ اپنے خیالات اور سوچ بچار کے نتائج کو اس کتابچہ میں پیش کر سکوں۔ انٹرنیٹ پر ابرہیم شفیع کے صفحہ نے جو اسلامی معلومات سے بھرا ہوتا ہے ربا کے بارے میں ساری قرآنی آیات اکٹھا کرنے میں میری مدد کی۔ میں اس صفحہ کے بنانے والوں کا نہایت تہ دل سے شکر گذار ہوں کہ اللہ ان کو ان کے اس عمل کی پوری پوری جزا دے، آمین۔

اس کتابچے کے ابواب شروع میں علیحدہ علیحدہ مضامین کی صورت میں چھپوانے کی نیت سے لکھے گئے تھے، اس لئے اسکے ہر باب کی ایک جداگانہ حیثیت رکھی گئی۔ پہلے تین یا چار ابواب لکھنے کے بعد میں نے انہیں ایک کتابچے کی شکل میں اکٹھا چھپوانے کا ارادہ کیا لیکن ان کی جداگانہ حیثیت کو برقرار رکھا، تاکہ پڑھنے والے کو اگر کوئی ایک باب پڑھنا ہو تو وہ کوئی دشواری محسوس نہ کرے اور حوالے کے لئے اسے کسی دوسرے باب میں نہ جانا پڑے۔ اس کے باوجود میری صلاح یہی ہو گی کہ اس کتابچے کو ابواب کی دی ہوئی ترتیب سے ہی پڑھا جائے تاکہ ربا کا قرآنی تصور واضح ہو۔

---

[1] یہ جملہ اصل کتاب میں نہیں تھا مگر مترجم نے اسے اپنی طرف سے شامل کیا ہے۔

آخر میں میں چاہوں گا کہ یہ بات اچھی طرح سے سمجھ لی جائے کہ ہمارے لئے جو چیز مقدس (Sacrosanct) ہے اور جس پر کوئی سوال نہیں اٹھایا جاسکتا وہ صرف اور صرف اللہ کی وہ ہدایات اور احکامات ہیں جو اس نے اپنے آخری پیغمبر حضرت محمد ﷺ کے ذریعے سے انسانیت کو پہنچائے۔ لیکن جن الفاظ کے ذریعے سے وہ ہدایات اور احکامات ہمیں دیئے گئے ہیں ان میں سے کچھ الفاظ کو مختلف مفسرین نے ایک سے زیادہ مگر باہمی طور پر متضاد اور متناقض (Mutually Incompatible) معنی پہنائے ہیں۔ اس لئے ان معانی کو بذات خود غیر متبدل (Inviolable) نہیں مان لینا چاہیئے۔ میرا یہ یقین کامل ہے کہ ربا جیسے کچھ مشکل الفاظ یا اصطلاحوں کے معانی اور ان کی تشریحات کو خود قرآن پاک میں سے ڈھونڈا جاسکتا ہے۔ وہ معانی یا تشریح جو قرآن کی تشریح کے ساتھ میل نہ کھائے اسے مسترد کر دینا چاہیئے۔ اس کتابچے میں میں نے ربا کی قرآنی تشریح کو واضح کرنے کی پوری عاجزانہ (Humble) کوشش کی ہے۔ تاہم قارئین خود بھی قرآنی مطالعہ کے ذریعے سے اپنے ضمیر کو مطمئن کر سکتے ہیں کہ اس کتابچے میں دیئے گئے حقائق کس حد تک صداقت پر مبنی ہیں۔ یہ رویہ ہمیں اسلام کے بارے میں ہر لکھی جانے والی کتاب کے بارے میں اپنانا چاہیئے۔ یہ ہمارا فرض بنتا ہے کیونکہ اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو ہماری آخرت کی ساری خوشیاں اور شادمانیاں خطرے میں پڑ سکتی ہیں اور ان کے بدلے میں خدا بچائے ہمارے حصہ میں ہمیشہ ہمیشہ کے دکھ اور پریشانیاں ہونگی۔

محمد شفیع
ممبئی انڈیا
24جون،1998

اشاعت دوم

اس اشاعت میں ان معمولی غلطیوں کی تصحیح کر دی گئی ہے جو پہلی اشاعت میں کسی نہ کسی وجہ سے رہ گئی تھیں۔ اس کے علاوہ **باب 4** کے آخر پر ایک پیرہ گراف اور کتابچے کے آخر میں تین ضمیمے **الف، ب اور ج** بھی منسلک کر دیئے ہیں۔ میں نے اس کتابچے کو زیادہ موزوں اور قابل فہم بنانے کے لئے ٹائٹل میں ایک معمولی سی تبدیلی بھی کی ہے۔ میرے خیال میں یہ تبدیلیاں کتابچے میں پیش کئے گئے نقطہ نظر کو اور زیادہ تقویت پہنچانے کا سبب بنیں گی۔

محمد شفیع
ممبئی انڈیا
22جنوری،2000

اشاعت سوم

اس اشاعت میں میں نے پچھلی اشاعت کے چھ ابواب پر نظر ثانی کی ہے اور اس میں مزید پانچ ابواب کا اضافہ کیا ہے۔ اب یہ کتاب علیحدہ علیحدہ ابواب پر مشتمل ہونے کی بجائے مجموعی طور پر ایک مکمل (Integrated) کتاب ہے۔ کچھ حلقوں کی طرف سے یہ اعتراض بھی سامنے آیا کہ اس موضوع پر احادیث مبارکہ کو سابقہ اشاعتوں میں بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اس اعتراض کو دور کرنے کے لئے ان پانچ ابواب میں سے جو اس اشاعت میں شامل کئے گئے ہیں چار ابواب خصوصی طور پر صرف متعلقہ احادیث سے ہی متعلق ہیں۔ اسی وجہ سے ایک چوتھا ضمیمہ **د** بھی شامل کیا گیا ہے۔ پچھلی اشاعت کے تین ضمیموں کو علٰی حالہ رہنے دیا گیا ہے۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ قارئین ان ضمیموں اور کتاب کے ابواب میں کچھ نقاط کے معاملے میں تکرار محسوس کریں۔ تاہم یہ تکرار ان نقاط کو اچھی طرح سمجھنے میں ممد ثابت ہو گی۔ پانچ ابواب جو اب شامل کئے گئے ہیں ان میں آخری باب بیمہ (Insurance) اور حقوق نقل و اشاعت (Copyrights) سے متعلقہ ان سوالوں کا احاطہ کرتا ہے جن کا تعلق اس کتاب کے تصور **الربوا** سے بنتا ہے۔ میں نے پھر ایک بار کتاب کے عنوان میں تبدیلی کی ہے تا کہ اس کی تان (Tune) قرآنی بیان کے مطابق ہو جائے۔ ایک ذیلی عنوان کا بھی اضافہ کیا ہے تا کہ اس بات کی بھی وضاحت ہو سکے کہ جو احکام الٰہیہ اس کتاب میں بیان کئے گئے ہیں وہی اصول معاشیات کے الٰہی تصور کے عین مطابق ہیں۔ میری اللہ تبارک و تعالٰی سے دعا ہے کہ وہ اس کتاب کی نظر ثانی شدہ اشاعت کو مسلمانوں کے لئے خصوصاً اور تمام انسانوں کے لئے عموماً صحیح قرآنی تعلیمات اور صراط مستقیم کی طرف واپس لانے میں ایک موثر ذریعہ ثابت ہو۔ آمین!

محمد شفیع

ممبئی انڈیا

13 دسمبر، 2000

اشاعت چہارم

یہ اشاعت کتاب کے چھپوانے کے لئے ہے۔ میں نے نفس مضمون کو عام لوگوں کے لئے عام فہم اور سہل بنانے کی غرض سے عنوان میں تبدیلی کرنے کے علاوہ اس کتاب میں اور کوئی تبدیلی نہیں کی۔

محمد شفیع
ممبئی انڈیا
29 جولائی، 2007

اشاعت پنجم

پچھلی اشاعتوں میں جو کچھ غلطیاں رہ گئیں تھیں صرف ان کو درست کرنے کے لئے کتاب پر نظر ثانی کی گئی ہے۔

محمد شفیع
ممبئی انڈیا
25 اکتوبر، 2010

1۔الرِّبا کیا ہے؟

1.1۔ اللہ تعالیٰ سورہ الروم کی آیت نمبر 39 میں فرماتے ہیں "وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ "یعنی (وَمَآ اٰتَيْتُمْ) اور جو کچھ بھی تم دیتے ہو (مِّنْ رِّبًا) بڑھنے کے لئے یعنی نفع کے لئے (لِّيَرْبُوَا) اس طرح کہ وہ بڑھے یعنی نفع دے (فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ) لوگوں کے جائز اموال یعنی املاک، آمدنیوں اور واجبات میں سے، (فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ) پس وہ اللہ کے ہاں ہر گز نہیں بڑھتا۔ (وَمَآ اٰتَيْتُمْ) اور جو تم دیتے ہو (مِّنْ زَكٰوةٍ) خیرات میں (تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ) اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے (فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ) سو ایسے ہی لوگ ہیں اپنے مال میں اضافہ کرنے والے۔

1.1.1۔ یہ آیت نزول کے اعتبار سے ربا کے بارے میں پہلی آیت ہے۔ عربی میں ربا کے لغوی معنی اضافے، فائدے یا بڑھوتری کے ہوتے ہیں۔ اس کی فعلی شکل ربو (ر۔ب۔و) ہوتی ہے جس کے معنی اضافہ ہونے یا بڑھنے کے ہوتے ہیں۔

1.1.2۔ اللہ تعالیٰ یہاں پر ہر قسم کے اضافے، بڑھوتری یا منافع کو منع نہیں فرمارہے ہیں، بلکہ یہ نفع کی ایک خاص صورت ہے جس کو منع کیا جارہا ہے اور یہ منافع کی وہ صورت ہے جو لوگوں کے مال میں سے حاصل کی جائے۔

1.1.3۔ لوگوں کے اموال ان کی وہ املاک ہوتی ہیں جن کے وہ جائز، منصفانہ یا قانونی طریقے سے مالک ہوتے ہیں۔ اس اصطلاح میں ان کی وہ جائز کمائیاں بھی شامل ہوتی ہیں جو ان کی ابھی ملکیت میں نہیں آئی ہوتیں، مثلاً وہ تنخواہ جو کسی ملازم نے جائز طریقے سے کمائی ہوتی ہے مگر ابھی تک اس کی ادائیگی نہ ہوئی ہو۔ اس اصطلاح میں وہ جائز واجبات بھی شامل ہوتے ہیں جو مثال کے طور پر کوئی شخص اپنی کوئی جائز جائیداد میں سے کچھ حصہ کسی دوسرے شخص کو عارضی طور پر استعمال یا اس کی حفاظت کے لئے دیتا ہے۔

1.1.4۔ پس اس آیت کے پہلے حصہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر قسم کی بڑھوتری یا نفع لینے سے منع نہیں فرمارہے بلکہ وہ ایک خاص قسم کی بڑھوتری یا نفع ہے جس کو لینے سے منع کیا جارہا ہے۔ اور وہ خاص قسم کی بڑھوتری یا نفع وہ ہے جو بجائے اپنے مال کے دوسرے لوگوں کے اموال میں سے حاصل کی جائے۔ صاف ظاہر ہے اللہ ایسے نفع یا بڑھوتری کو اس لئے ناپسند کرتا ہے کیونکہ اس کے لینے میں ناانصافی کا عنصر شامل ہوتا ہے۔ ایسی بڑھوتری یا نفع لینے والے حقیقتاً دوسروں کے جائز اموال ہڑپ کر رہے ہوتے ہیں۔

1.1.5۔وہ ربا یا بڑھوتری (Gain) کی خاص قسم جس سے اللہ تعالیٰ ناپسند فرمارہے ہیں اسی آیت میں آگے جاکر زکٰوۃ (Charity) سے موازنہ کرکے وضاحت کے ساتھ بیان کی جارہی ہے۔جب تم زکٰوۃ میں کچھ دیتے ہو تو اسے اپنے مال میں سے دیتے ہو اور اس کے بدلے میں وصول کنندہ سے کسی فائدے کی توقع بھی نہیں رکھی جاتی۔دوسری طرف ربا کی زیر بحث قسم میں تم اپنے مال کے ساتھ ساتھ دوسروں کے اموال میں سے بھی کچھ نہ کچھ ہڑپ کر جاتے ہو۔

1.1.6۔پس اس آیت میں اللہ تعالیٰ ربا کی اس خاص قسم کی وضاحت فرمارہے ہیں جسے وہ ناپسند کرتے ہیں۔یہ وہ بڑھوتری یا اضافہ (Gain) ہے جو ایک شخص لین دین کے دوران جعل سازی کے ذریعے سے دوسروں کے جائز واجبات، کمائیاں اور املاک ہڑپ کرکے بٹورتا ہے۔ اس کے بعد اس موضوع پر نازل ہونے والی آیات میں ربا کی اس خاص قسم کو الربا کہہ کر پکارا گیا ہے۔اس اصطلاح میں ربا سے پہلے ال کا سابقہ لگا کر اس کو ربا کی ایک مخصوص قسم بنا دیا گیا ہے۔جس طرح انگریزی میں کسی اسم نکرہ (Common Noun) سے پہلے the لگا کر اسے اسم معرفہ (Proper Noun) بنادیا جاتا ہے اسی طرح عربی میں کسی اسم نکرہ کو اگر اسم معرفہ بنانا ہو تو اس سے پہلے ال لگایا جاتا ہے۔بعد میں ربا کے موضوع پر نازل ہونے والی تمام آیات میں بلا استثناء ربا سے پہلے ال لگایا گیا ہے جو سورہ الروم کی آیت نمبر 39 میں ربا کے اسم نکرہ کو اسم معرفہ یعنی ربا کی خاص قسم بنا رہا ہے۔

1.1.7۔پس بر خلاف ایک عمومی اعتقاد کے، قرآن میں الربا کے معنوں کی پوری طرح سے وضاحت کر دی گئی ہے۔نہ صرف اس کے معنوں کی پوری وضاحت کر دی گئی ہے بلکہ اس کی دوسری آیات کے اندر مزید تشریح بھی کر دی گئی ہے جس کو ابھی ہم پوری طرح سے سمجھنے کی کوشش کریں گے۔یہ خیال رہے کہ سورہ الروم کی آیت 39 میں الربا کی وضاحت کے ساتھ ساتھ اس کی مذمت بھی کی گئی ہے مگر ابھی اس کو منع نہیں کیا گیا۔

1.2۔قرآن کا طریقہ کار یہ ہے کہ وہ کسی برائی کی یک بارگی مکمل بیخ کنی کرنے کی بجائے اس سلسلے میں تدریجی طریقہ کار کو اپناتا ہے۔اس طریقہ کار کے مطابق سورہ روم میں الربا کی پہلے مذمت کی گئی اور پھر اس سلسلے کی دوسری آیات میں اس پر پابندیاں لگائی گئیں۔نزولی ترتیب کے حساب سے دوسری آیت یعنی سورہ اٰل عمران کی آیت نمبر 130 میں ارشاد ہوتا ہے۔"یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْکُلُوْا الرِّبٰوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۪ وَّاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ" (اٰل عمران:130)۔اے لوگو جو ایمان لائے ہو مت کھاؤ الربا دوگنا اور چوگنا کے حساب سے اور ڈرو اللہ سے تاکہ تم فلاح پاؤ۔

1.2.1۔ یہاں سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اس آیت میں اَضۡعَافًا مُّضٰعَفَةً یعنی حد سے زیادہ (Exorbitant) الربا لینے کی ممانعت کی گئی ہے لیکن ابھی مکمل ممانعت نہیں کی گئی۔ شاید یہ اس وجہ سے کیا گیا کہ ان کی معیشت میں کوئی ایک دم بھونچال نہ آجائے اور وہ تعطل کا شکار نہ ہو جائے۔ اس کی بجائے زور زیادہ تقویٰ اور پرہیز گاری پر دیا گیا۔

1.2.2۔ ہاں جو بات قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ ربا جس کی سورہ الروم میں تعریف اور وضاحت کر دی گئی تھی اس کا باقاعدہ حوالہ اب آل عمران کی اس آیت 130 میں آگیا ہے۔

1.3۔ اس سلسلے کی تیسری آیت جو نازل کی گئی وہ سورہ النساء کی آیت نمبر 161 ہے۔ یہ آیت بیان کر رہی ہے کہ "وَ اَخۡذِهِمُ الرِّبٰوا وَ قَدۡ نُهُوۡا عَنۡهُ وَ اَكۡلِهِمۡ اَمۡوَالَ النَّاسِ بِالۡبَاطِلِ ؕ وَ اَعۡتَدۡنَا لِلۡكٰفِرِيۡنَ مِنۡهُمۡ عَذَابًا اَلِيۡمًا" (النساء: 161)۔ اور لیتے ہیں وہ الربا جب کہ روک دیا تھا ان کو اس سے اور کھاتے ہیں لوگوں کے اموال ناجائز طریقے سے۔ اور تیار کر رکھا ہے ہم نے ان کے لئے جو چھپاتے ہیں حق کو (یعنی جو کافر ہیں) ان میں سے دردناک عذاب۔

1.3.1۔ مندرجہ بالا آیت میں هِمۡ کی ضمیر یہود کی طرف لوٹ رہی ہے کیونکہ الربا سے ان کو ہی روکا گیا تھا۔ اس لئے اس آیت میں مسلمانوں کو مطلع کیا جا رہا ہے کہ وہ بھی الربا کے بارے میں حکم امتناعی سننے کے لئے تیار رہیں۔

1.3.2۔ پس مسلمانوں کو اللہ کے حکم کی نافرمانی کے نتائج سے پیشگی متنبہ کیا جا رہا ہے۔

1.3.3۔ یہاں پر الربا کے قرآنی مفہوم کی مزید وضاحت کی جا رہی ہے اور مسلمانوں کو مطلع کیا جا رہا ہے کہ اس اصطلاح کا اطلاق ناجائز طریقے سے دوسرے لوگوں کے اموال کھانے (ہڑپ کرنے) پر ہوتا ہے۔

1.4۔ اب ہم آیات کے اس گروپ کی طرف آتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے الربا کے بارے میں آخر میں نازل کیں۔ یہ آیات ترتیب نزولی کے اعتبار سے قرآن کی تقریباً آخری آیات ہیں۔

1.5۔ اس گروپ کی پہلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے کہ "اَلَّذِيۡنَ يَاۡكُلُوۡنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوۡمُوۡنَ اِلَّا كَمَا يَقُوۡمُ الَّذِىۡ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيۡطٰنُ مِنَ الۡمَسِّ ؕ ذٰ لِكَ بِاَنَّهُمۡ قَالُوۡۤا اِنَّمَا الۡبَيۡعُ مِثۡلُ الرِّبٰوا ‌ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الۡبَيۡعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنۡ جَآءَهٗ مَوۡعِظَةٌ مِّنۡ رَّبِّهٖ فَانۡتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَاَمۡرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَمَنۡ عَادَ فَاُولٰٓـئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ‌ۚ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ" (البقرہ: 275) اور جو لوگ کھاتے ہیں الربا نہیں اٹھیں گے وہ (قیامت کے روز) مگر جیسے اٹھتا ہے وہ شخص جسے باؤلا کر دیا ہو شیطان نے چھو کر، یہ حال اس لئے ہو گا کہ وہ کہتے تھے کہ تجارت بھی

تو الربا ہی کی مانند ہے۔ حالانکہ حلال کیا ہے اللہ نے تجارت کو اور حرام کیا ہے الربا کو، لہٰذا جس کو پہنچ گئی نصیحت اس کے رب کی طرف سے اور وہ باز آ گیا تو اس کا ہے وہ جو پہلے لے چکا، اور معاملہ اس کا اللہ کے حوالے اور جس نے پھر لیا (الربا) تو ایسے ہی لوگ ہیں جہنمی وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

1.5.1۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بالآخر الربا کو مکمل طور پر ممنوع قرار دے دیا ہے۔ اور دوسری طرف **بیع** یعنی تجارت (جس میں اشیاء اور خدمات کا ایک مناسب منافع پر لین دین ہوتا ہے) کی ایک جائز سرگرمی کے طور پر اجازت دی جارہی ہے۔

1.5.2۔ اس آیت کی ایک بہت ہی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں الربا کی اصطلاح کی ایک غلط تشریح کا حوالہ بھی دیا جارہا ہے جس کو اس وقت کچھ لوگ الربا کے جواز میں پیش کرتے تھے اور وہ ایسا کچھ شیطانی اثر کے تحت کرتے تھے۔ اس شیطانی اثر کے دھوکے میں وہ تجارت کو الربا کے مثل قرار دیتے تھے۔

1.5.3۔ قرآن کے نزول کے زمانے میں جو لوگ الربا کی غلط تشریح کرتے تھے ان کے بارے میں تو کچھ معلوم نہیں ہے۔ ہاں البتہ ہم آج کل کے دور کے کچھ ایسے لوگوں سے ضرور واقف ہیں جو ایسی تجارت کرتے ہیں جس کو اللہ نے تجارت نہیں بلکہ الربا کہا ہے۔ وہ دوسرے لوگوں کے اموال ناجائز طریقوں سے کھاتے ہیں تاہم ان کو دوسرے لوگوں کے اموال ہڑپ کرتے ہوئے اس کا خیال کبھی نہیں آتا کہ یہ الربا ہے۔

1.5.4۔ وہ ایسا سب کچھ بڑے دھڑلے اور ٹھیک ٹھاک طریقے سے کرتے ہیں۔ کچھ ان میں سے گورنمنٹ اور دوسرے قانونی اداروں کے واجب الادا ٹیکسوں اور رقوم کو مختلف حیلے بہانوں سے ٹال جاتے ہیں۔ کچھ جنہوں نے تجارت کے پیشے کو اختیار کیا ہوتا ہے اشیاء کی مصنوعی قلت پیدا کر کے یا پھر بازار میں قلت کی صورت حال کا فائدہ اٹھا کر اپنے منافعوں میں کئی کئی گنا کا اضافہ کر لیتے ہیں۔ کارخانے اور فیکٹریوں کے مالکان اپنے ملازمین سے کام تو پورا لیتے ہیں مگر ان کے معاوضوں میں کٹوتیاں لگا دیتے ہیں۔ ملازمین خاص طور پر گورنمنٹ ملازمین تنخواہ تو پوری لیتے ہیں مگر کام گھٹا دیتے ہیں۔ ٹیکسی ڈرائیور کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر میٹر ریڈنگ سے زیادہ کا مطالبہ کر دیتے ہیں۔

1.5.5۔ اس قسم کے جرائم سے تقریباً تمام شعبہ ہائے زندگی کی داستانیں بھری پڑی ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے اس قسم کے جرائم کا ارتکاب کرنے والے عموماً بہت ہی مذہبی قسم کے لوگ خیال کئے جاتے ہیں۔ ایسے ریاکار عموماً پاکیزگی کے زعم اور دین پر عمل پیرا ہونے کی خوشی میں مبتلا رہتے ہیں اور ان کو اس بات کا بالکل احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ خود الربا لینے کے مجرم بن رہے ہوتے ہیں۔

1.5.6۔ اور آیت میں ایسے ہی لوگوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ شیطان نے چھو کر ان کو باؤلا کر دیا ہے۔

1.5.7۔ پھر اللہ تعالیٰ اس آیت میں الربا لینے سے باز آنے والوں کے لئے ایک عام معافی کا اعلان فرماتے ہیں۔ اگرچہ ایسے لوگوں کو سابقہ الربا سے حاصل کیا ہوا منافع اپنے پاس رکھنے کی اجازت دی گئی ہے لیکن ان کی قسمت کا فیصلہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کے حکم پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ شاید اللہ تعالیٰ ان کے لئے فیصلہ ان کے آئندہ کے رویے کو دیکھ کر کرے گا۔

1.5.8۔ لیکن وہ لوگ جو الربا لینے پر اصرار کرتے ہیں آخرت میں ان کی قسمت کا فیصلہ کر دیا گیا کہ وہ ہمیشہ کے لئے جہنم میں جائیں گے۔

1.6۔ سورہ البقرہ کی اگلی آیت اعلان کرتی ہے کہ "یَمۡحَقُ اللّٰہُ الرِّبٰوا وَیُرۡبِی الصَّدَقٰتِ ؕ وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ کُلَّ کَفَّارٍ اَثِیۡمٍ" (البقرہ 276:)۔ مٹاتا ہے اللہ الربا کو اور بڑھاتا ہے صدقات کو۔ اور اللہ نہیں پسند کرتا کسی ناشکرے گناہ گار کو۔

1.6.1۔ مزید اس آیت میں اللہ تعالیٰ الربا کے مجرموں کے بارے میں اپنی شدید ناراضگی کا اظہار کر رہے ہیں۔ یہ ناراضگی انفرادی سطح پر شائد فوری طور پر سمجھ میں نہ آئے۔ ایک شخص جو الربا میں ملوث ہوتا ہے وہ کچھ عرصہ تک خوش حال نظر آسکتا ہے کیونکہ اللہ کچھ عرصے کے لئے اس کی رسی ڈھیلی چھوڑ دیتا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ شخص اس دنیا سے رخصت ہونے تک بظاہر خوش حال ہی نظر آئے۔ اللہ کی تنبیہ خاص طور پر آخرت کے لئے ہے۔ اس دنیا کی زندگی آخرت کی نا ختم ہونے والی زندگی کے مقابلے میں بہت ہی تھوڑی ہے۔ تاہم بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس دنیا میں بھی کچھ لوگوں کو دوسروں کے لئے نشان عبرت بنا دیتا ہے اور ان کی ناجائز ذرائع سے کمائی ہوئی دولت کو ان کے سامنے ہی تباہ و برباد کر دیتا ہے۔

1.6.2۔ قوموں اور قومیتوں کی سطح پر الربا کے معاملات کے بارے میں اللہ کی ناراضگی بہت جلد سمجھ میں آجاتی ہے۔ وہ قومیں اور قومیتیں جہاں بدعنوانی (Corruption) روز بروز بڑھ رہی ہو ان کی معیشت ہمیشہ ڈانواں ڈول ہی رہتی ہے۔ معاشی یا اقتصادی بدعنوانی (Economic corruption) کا نام ہی تو الربا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ کوئی قوم بھی مکمل طور پر بدعنوانی سے پاک نہیں ہے، لیکن وہ قومیں جہاں یہ بیماری کم ہو گی ان ہی کی معیشتیں نسبتاً زیادہ مضبوط اور بہتر ہو نگی، چاہے ان کے پاس قدرتی وسائل کی کمی ہی کیوں نہ ہو۔

1.6.3۔ اس آیت میں الربا کا موازنہ صدقات سے کیا جا رہا ہے۔ عربی میں صدقات کا لفظ ان اخلاقی واجبات کی ادائیگیوں کے لئے استعمال کیا جاتا جو مستحقین یعنی غریب اور ضرورت مند لوگوں کو کی جاتی ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ اللہ نے ان صدقات کو فرض کیا ہے

جیسا کہ سورہ التوبہ میں ارشاد ہوتا ہے "اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلۡفُقَرَآءِ وَ الۡمَسٰکِیۡنِ وَ الۡعٰمِلِیۡنَ عَلَیۡہَا وَ الۡمُؤَلَّفَۃِ قُلُوۡبُہُمۡ وَ فِی الرِّقَابِ وَ الۡغٰرِمِیۡنَ وَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَ ابۡنِ السَّبِیۡلِ ؕ فَرِیۡضَۃً مِّنَ اللّٰہِ ؕ وَ اللّٰہُ عَلِیۡمٌ حَکِیۡمٌ" (التوبہ:60) حقیقت یہ ہے کہ صدقات تو دراصل فقراء اور مساکین کے لئے ہیں اور (ان کے لئے ہیں) جو مامور ہیں صدقات کے کام پر اور (ان کے لئے) جن کی تالیف قلب مطلوب ہو، اور گردنوں کے چھڑانے کے لئے اور قرضداروں کی مدد کرنے کے لئے اور اللہ کی راہ میں اور مسافر نوازی میں (خرچ کرنے کے لئے ہیں)۔ یہ فریضہ ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ سب کچھ جاننے والا، بڑی حکمت والا ہے۔ یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ الربا کے معاملات میں لوگوں کے لین دین میں اخلاقی ذمہ داریوں کی عدم تکمیل بھی شامل ہوتی ہے کیونکہ صدقات ہمارے اموال کے اندر غرباء اور مساکین کے وہ واجبات (حقوق) ہیں جو ہمارے لئے ان کو دینا فرض کیا گیا ہے۔ اس لئے اگر وہ ان کو ادا نہیں کئے جائیں گے تو ہم الربا کھانے کے مرتکب ہونگے۔ ذرا غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ اللہ نے یہاں الربا کے ان معنی کی وضاحت کر دی ہے جو سورہ الروم کی آیت نمبر 39 میں بیان کئے گئے تھے۔

1.7۔ اب ہم نزولی اعتبار سے ان دو آخری آیات کی طرف آتے ہیں جو خاص طور پر الربا سے متعلق ہیں۔ چونکہ یہ ایک دوسرے کے ساتھ باہمی طور پر مربوط اور قریب ہیں اس لئے ان کو اکٹھا لیا جارہا ہے۔ فرمایا جارہا ہے "یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَ ذَرُوۡا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰۤوا اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ" (البقرہ:278)۔ "فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا فَاۡذَنُوۡا بِحَرۡبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ ۚ وَ اِنۡ تُبۡتُمۡ فَلَکُمۡ رُءُوۡسُ اَمۡوَالِکُمۡ ۚ لَا تَظۡلِمُوۡنَ وَ لَا تُظۡلَمُوۡنَ" (البقرہ:279)۔ اے ایمان والو! ڈرو اللہ سے اور چھوڑ دو جو باقی رہ گیا ہے الربا میں سے اگر ہو تم واقعی ایمان والے۔ اور پھر اگر تم ایسا نہیں کرتے (الربا کو نہیں چھوڑتے) تو تیار ہو جاؤ لڑنے کے لئے اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اگر تم توبہ کر لو (اور چھوڑ دو الربا کو) تو تم حق دار ہو اصل اموال کے، نہ تم ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے۔

1.7.1۔ یہ آیات بھی الربا کے قرآنی تصور کو سمجھنے کے لئے بہت اہم ہیں۔ ان میں سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ ایک مرتبہ پھر الربا پر بطور ایک سنگین برائی اور اخلاقی جرم کے زور دے رہے ہیں۔ یہ انسانیت کے خلاف ایک بھیانک جرم ہے۔ یہ اس دنیا میں تمام معاشی ناانصافیوں اور اور ناہمواریوں کے ارتکاب کا جرم ہے۔ یہ ہمارے لئے تمام مصیبتوں کو ظہور میں لانے والے اسباب میں سے سب سے بنیادی اور اہم سبب ہے۔ یہ انسانیت کو اس سیدھے راستے سے بہت دور لے جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے متعین فرمایا ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ اعلان فرمارہے ہیں کہ وہ لوگ جو الربا کھانے میں ملوث ہیں وہ اللہ اور اس کے رسول کے خلاف جنگ کے لئے تیار ہو جائیں۔

1.7.2۔ پھر ان دو آئیتوں میں سے دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ اعلان فرمارہے ہیں کہ ایسے لوگ جو الربا لینے سے باز آجائیں وہ اپنے سرمایے کے واجبات واپس لینے کا حق رکھتے ہیں۔ یہاں پر جو عربی جملہ رُءُوسُ اَمْوَالِكُمْ کا استعمال ہوا ہے اس سے مراد وہ اموال کے واجبات ہی ہیں۔ یہ ہم 1.1.3 میں دیکھ چکے ہیں کہ اموال میں کیا کیا شامل ہیں۔ لیکن یہاں پر الربا کے معنی ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لئے لفظ "اموال" کے ایک اور اہم پہلو پر زور دینے کی بھی ضرورت ہے۔

1.7.3۔ اس پہلو کو سمجھنے کے لئے پہلے یہ بات اچھی طرح سے ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ رقم یا زر یعنی روپیہ پیسہ (Money) برائے خود اموال نہیں ہیں۔ روپیہ پیسہ یا رقم صرف اموال کی موجودہ مالیت ہے۔ ایک ہی مقدار اور ایک ہی کوالٹی کے اموال کی مختلف اوقات میں مختلف مالیت ہو سکتی ہے۔ اگر ایک خاص کوالٹی کی ایک کلوگرام چینی کی مالیت آج 60 روپے ہے، ہو سکتا ہے دس سال پہلے اس کی مالیت 20 روپے ہو۔ اور اگر آج ایک مزدور کی ایک دن کی مزدوری 500 روپے ہے تو ہو سکتا ہے دس سال پہلے یہ مزدوری 100 روپے ہو۔ پس جب کہ اموال (چینی اور مزدوری جن کی مثال یہاں دی جارہی ہے) وہی رہتے ہیں لیکن ان کی مالیت روپے پیسے کی صورت میں بدل سکتی ہے۔

1.7.4۔ اب بڑی احتیاط سے یہ بات مد نظر رہنی چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ نے (جس کا علم ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے) جب بھی الربا کے حوالے سے بات کی ہے تو اموال کے الفاظ سے ہی کی ہے نہ کہ ان کی مالیت یا روپے پیسے یعنی رقوم (Money) کے الفاظ سے۔ زیر بحث دونوں آئیتوں میں بھی وہ ہمیں بتا رہا ہے کہ ہم اپنے حقیقی اموال (رقوم نہیں جیسا کہ بعض لوگ اموال کا ترجمہ کرتے ہیں) واپس لینے کا حق رکھتے ہیں۔ آیئے ذرا تفصیل سے دیکھیں کہ اس کا مطلب کیا ہے۔

1.7.5۔ فرض کریں میں بہت امیر ہوں (اگرچہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے) اور میرا ایک دوست بھی خاصہ امیر ہے۔ لیکن دو سال قبل میرا یہ دوست مالی پریشانیوں میں گھرا ہوا تھا اور اس وقت اس کو ایک گاڑی خریدنے کی اشد ضرورت تھی۔ اس وقت میں نے ایک X برانڈ اور Y ماڈل کی کار خریدی تھی، وہ میں نے اپنے دوست کو دے دی اور اپنے لئے ایک دوسری کار خرید لی۔ اب اس واقعہ کے دو سال بعد، میرے دوست نے مالی پریشانیوں سے چھٹکارہ حاصل کر لیا ہے اور وہ میرا قرضہ ادا کرنا چاہتا ہے۔

1.7.6۔ وہ یہ کیسے کرے؟ وہ یہ تو نہیں کر سکتا کہ جو کار اس نے مجھ سے دو سال قبل لی تھی اور جسے وہ دو سال تک استعمال کرتا رہا ہے اسے ہی واپس کر دے۔ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو مجھ پر ظلم ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ زیر بحث آیت میں فرماتے ہیں کہ مجھ پر ظلم نہ کیا جائے۔ لیکن مجھ پر ظلم صرف اس صورت میں نہیں ہو گا کہ اگر مجھے اب ایک نئی کار کی ضرورت ہو تو میرا دوست ایک X برانڈ اور

Y ماڈل کی نئی کار خرید کر مجھے دے دے۔ یہ بھی اس صورت میں جب میں دوستی کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنے دوست سے اس کے دو سال تک میری کار کو استعمال کرنے کا معاوضہ طلب نہ کروں۔

1.7.7۔ لیکن اب اگر میں اس قسم کی پرانے ماڈل کی کار نہ خریدنا چاہوں بلکہ یہ چاہوں کہ Z ماڈل کی ایک نئی کار خریدوں تو پھر کیا ہونا چاہیئے؟ میں اپنے دوست کو یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ وہ مجھے Z ماڈل کی ایک نئی کار لے کے دے کیونکہ اگر میں اپنے دوست سے یہ مطالبہ کرتا ہوں تو پھر تو اس پر ظلم ہو گا اور اللہ معاف کرے میں زیر بحث آیت میں دیئے ہوئے واضح حکم کی خلاف ورزی کر رہا ہونگا۔ پس اس صورت میں میرے دوست کے پاس جو صحیح راستہ ہو گا وہ یہی ہو گا کہ وہ مجھے X برانڈ والی Y ماڈل کی نئی کار کی موجودہ بازاری قیمت (Current Market Price) کے حساب سے ادائیگی کر دے۔ اسے یہ اس صورت میں بھی کرنا چاہیئے اگر ان دو سالوں کے دوران مذکورہ کار کی قیمت میں چند ہزار روپے کا اضافہ ہی کیوں نہ ہو گیا ہو۔ اسی صورت میں کسی بھی فریق پر ظلم نہیں ہو گا۔

1.7.8۔ اسی پر قیاس کرتے ہوئے اگر میرا دوست مجھ سے کار کی بجائے کار کی قیمت یا مالیت فرض کریں200،000روپے مجھ سے ادھار لیتا، تو اسے اب وہ رقم مع ان چند ہزار روپوں کے (جن کے برابر کار کی قیمت یا مالیت میں اضافہ ہوا ہے) مجھے واپس کرنی چاہیئے۔ اور اگر میرا دوست کار کی بجائے کسی اور گھریلو ضرورت کو پوری کرنے کے لئے قرضہ لیتا تو اب اس کو مجھے رقم کی موجودہ قدر (Value) کے مطابق ادئیگی کرنی چاہیئے جس کا حساب صارفین کی قیمت کے اشاریے (Consumer Price Index) سے لگایا جاسکتا ہے۔ اگر اس دوران اشاریہ 10 فیصد بڑھ گیا ہو تو میرے دوست کو وہ رقم اسی نسبت سے بڑھا کر دینی چاہیئے۔

1.7.9۔ سچ بات تو یہ ہے کہ رقم یعنی زر (روپے پیسے) کوئی مادی شے نہیں ہے بلکہ یہ ایک قوت خرید ہے — مادی اشیاء اور خدمات کو خریدنے کی قوت۔ جب میں نے دو سال پہلے وہ رقم اپنے دوست کو دی تھی تو میں نے اسے ایک قوت خرید دی تھی۔ ادھار دی ہوئی رقم نہیں بلکہ وہی قوت خرید جو میں نے اسے دی تھی قرآنی اصطلاح میں اصلی اموال بنتی ہے یعنی وہی اصلی قوت خریدَ۔ اگر وہ مجھے وہی رقم واپس لوٹائے گا تو وہ مجھے اصلی اموال سے کم واپس کر رہا ہو گا۔ یہ اس صورت میں ظلم ہو گا اور قرآنی حکم میں بگاڑ آجائے گا۔

1.7.10۔ اور اگر میرا دوست وہ رقم کسی نئے کاروبار میں سرمایہ لگانے کے لئے ادھار لیتا، تو قرضہ واپس کرنے کے عوامل بھی تبدیل ہو جاتے۔ اب اسے مجھ کو نہ صرف قوت خرید کی وہ مقدار جو اس نے مجھ سے ادھار لی تھی واپس کرنا پڑتی بلکہ اس کے ساتھ کاروبار سے ہونے والے منافع کا ایک متناسب حصہ بھی جو اس نے اس عرصے میں کمایا تھا وہ بھی اسے مجھ کو دینا پڑتا۔ یہ میرے دوست کی طرف سے ناانصافی اور ظلم شمار ہو گا کہ اگر وہ مجھے یہ حصہ نہیں دے گا کیونکہ بغیر اس قرض کے جو میں نے اسے دیا تھا اس

کا نیا کاروبار اس کے لئے سود مند نہیں ہو سکتا تھا۔ منافع جو کسی بھی کاروبار سے حاصل ہوتا ہے وہ بھی اموال میں ہی شامل ہوتا ہے۔ یہ منافع مندرجہ ذیل تین عوامل کا نتیجہ میں ہوا ہے اور یہ تین عوامل یہ ہیں۔

الف۔ وہ سرمایہ جو میرے دوست نے اپنے پلے سے لگایا،
ب۔ وہ قرضہ جو میں نے اپنے دوست کو دیا،
ج۔ وہ خدمات جو میرے دوست نے کاروبار میں لگائیں۔

ان تینوں عوامل میں سے ہر ایک کا یہ جائز حق ہے کہ اس کو کل منافع میں سے اس کا متناسب حصہ ملے۔ ان تینوں عوامل کے یہ تینوں حصے ان کے جائز مکسوبہ اموال ہیں۔ اگر میرا دوست مجھے وہ حصہ نہیں دیتا جو عامل ب نے کمایا ہے، اس کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ اپنی دولت میں اضافہ میرے اموال کو غصب کر کے کر رہا ہے۔ سورہ الروم کی آیت نمبر 39 کے مطابق یہ بالکل واضح طور پر الربا کا معاملہ ہو گا۔

1.7.11 ۔ یہاں ایک بات قابل غور ہے اور وہ یہ ہے کہ جب میں نے اپنے دوست کو قرضہ دیا تھا، تو میں نے اسے وہ چیز مہیا کی تھی جس کی اسے ضرورت تھی۔ یہ بالکل ایک پنساری جیسا معاملہ تھا جس نے میرے کنبے کو غذائی اشیاء فراہم کیں یا پھر ایک معمار جیسا جس نے مجھے اپنا کاروبار چلانے کے لئے ایک دفتر بنا کر دیا۔ ان دونوں پنساری اور معمار نے مجھ سے ان چیزوں کے مصارف کے علاوہ جو انہوں نے مجھے مہیا کیں اپنی خدمات کا معاوضہ بھی وصول کیا۔ یہی وہ ایک عمومی بنیاد ہے جس پر تمام انسانی لین دین ہوتے ہیں۔ ایسی خدمات کے وصول کرنے والے نہ تو ان خدمات کے معاوضہ کو غلط یا صحیح کہہ سکتے ہیں اور نہ ہی پیداواری یا غیر پیداواری۔ مثال کے طور پر معمار اس بنیاد پر اپنی خدمات کا معاوضہ نہیں لیتا کہ اس کے بنائے ہوئے دفتر میں جو میں کاروبار کروں گا وہ کامیاب ہو گا یا ناکام۔ اور نہ ہی پنساری اس وجہ سے کہ میں نے جو انڈے اس سے خریدے تھے وہ گھر آتے ہوئے مجھ سے نیچے گر کر ٹوٹ گئے، مجھے اپنے منافع میں سے کچھ واپس کرے گا۔

1.7.12 ۔ اس قسم کی خدمات کے معاوضوں یا منافعوں (یا جو کچھ بھی آپ ان کو نام دیں) کو ایک قاعدے کے مطابق پہلے سے طے شدہ متعین شرح پر شمار کیا جاتا ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے اس میں کچھ بھی غلط نہیں ہے۔ خدمات کے مناسب اور موزوں معاوضے خدمات مہیا کرنے والوں کے جائز اموال ہوتے ہیں اور یہ معاوضے لازمی طور پر خدمات مہیا کرنے والوں کی اس تگ ودو اور وقت کی مناسبت سے ہی متعین شرحوں پر شمار ہونے چاہییں جو انہوں نے خدمات مہیا کرنے میں صرف کیا۔ تاہم ان معاوضوں کے تعین کا زیادہ تر دارومدار بازاری قوتوں (Market Forces) یعنی طلب اور رسد کی قوتوں پر بھی ہوتا ہے۔

1.7.13۔ اس لئے مجھے اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ میں کیوں لازمی طور پر اپنے اس قرضہ کو جو میں نے دوسال پہلے اپنے دوست کو دیا تھا اس کے کاروبار کی کامیابی یا ناکامی سے مشروط کر دوں جب تک کہ ہم دونوں کاروبار میں حصہ دار بننے پر رضامند نہ ہو جائیں۔ اگر ہم کاوباری حصہ دار بننے پر رضامند نہیں ہوتے تو مجھے یہ مطالبہ کرنے کا حق حاصل ہے کہ میں دو سال تک جس قوت خرید سے محروم رہا ہوں اس کے مساوی میری تلافی کی جائے۔ اس عرصہ کے دوران میں قرضہ کی رقم اپنے کاروبار کے لئے چیزیں خریدنے اور منافع کمانے کے لئے استعمال کر سکتا تھا۔ اس لئے میں بجا طور پر ایک مناسب اور پہلے سے طے شدہ متعینہ شرح سے تلافی کا مطالبہ کر سکتا ہوں (مثلاً وہ شرح جس پر میں نے دوسال قبل اپنی سرمایہ کاری پر منافع کمایا تھا) یا بالکل اسی طرح جیسے پنساری یا معمار اپنی خدمات کا معاوضہ یا منافع طلب کرتا ہے۔

1.7.14۔ یہ کہنا کہ ایک متعینہ شرح پر اسلام (یا قرآن) کسی خدمت کے معاوضے کی وصولی یا تلافی (چاہے اس کا نام سود ہی کیوں نہ ہو) کی اجازت نہیں دیتا بالکل ایک من گھڑت اور فرضی کہانی لگتی ہے۔ اسلام جو ہم سے چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ ایسی شرحیں (Rates) مبنی بر انصاف، مناسب اور موزوں ہونی چاہئیں اور ان کا تعین اس اصول پر ہونا چاہیئے کی کہ نہ تو خدمت مہیا کرنے والے پر ظلم ہو اور نہ خدمت وصول کرنے والے پر۔ ہاں البتہ یہ اور بات ہے کہ میں اپنی دوستی کی خاطر اپنے دوست سے اس کی تلافی کا مطالبہ نہ کروں لیکن مجھے اس کا حق تو حاصل ہے۔

1.8۔ قرآن کسی مرد یا عورت کو اس کے واجب حقوق دینے سے انکار نہیں کرتا۔ لیکن یہ بڑی سختی سے تمام انسانوں کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ اپنے واجب حقوق کا مطالبہ کرنے میں انسانیت کا مظاہرہ کریں۔ آؤ اب اس آسمانی ہدایت کو الربا کے بارے میں قرآنی آیات پر مشتمل اس باب کے مختتمہ کے طور پر غور کریں۔

1.8.1۔ سورہ البقرہ کی آیت نمبر 280 میں جو اوپر بیان کردہ الربا کی آیات کے فوراً ابعد آرہی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "وَاِنْ کَانَ ذُوْ عُسْرَۃٍ فَنَظِرَۃٌ اِلٰی مَیْسَرَۃٍ ؕ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ" ۔ اگر ہو وہ (خدمت وصول کرنے والا) مشکل میں (تنگ دست)، تو مہلت دو اسے اس وقت تک (کہ اس کے لئے واجبات ادا کرنے میں) آسانی پیدا ہو جائے۔ اور اگر تم (مستحقین کو) بخش دو یہ تمہارے لئے بہتر ہو گا اگر تم سمجھو۔

1.8.2۔ مستحق افراد کی صورت میں واجبات کے بخش دینے کو اس آیت میں صدقات یا اخلاقی ذمہ داری کہا گیا ہے۔ اس اخلاقی ذمہ داری کو سمجھنے کے لئے اس صورت حال کو پھر میں اپنے دوست کو قرض دینے والے معاملے کے ساتھ جوڑتا ہوں۔ اگر میں دیکھتا ہوں کہ میرے دوست کی مالی مشکلات جاری ہیں تو مجھے اسے قرض کی واپسی کی مدت میں مزید توسیع دینی ہو گی۔ اور فرض کریں

میری مالی حالت بہتر ہے جبکہ میرے دوست کی مالی حالت روز بروز گرتی جارہی ہے اور گرتے گرتے اس حد تک چلی جاتی ہے وہ قابل قیاس مستقبل میں بھی قرضہ واپس نہیں کر سکتا۔ پھر اس قرآنی آیت کی رو سے یہ میری اخلاقی ذمہ داری بنتی ہے کہ میں وہ قرضہ اسے معاف کر دوں۔ اور بحیثیت ایک سچے مسلمان کے میرا یہ پختہ یقین ہونا چاہیئے کہ اللہ تبارک تعالیٰ اس **صدقے** کا اجر مجھے ضرور دے گا جیسا کہ اس نے سورہ البقرہ کی آیت نمبر 276 میں وعدہ کیا ہے۔

1.9۔ یہ میرا پختہ یقین ہے کہ محولہ بالا آیات کا ٹھنڈے دل کے ساتھ غیر جانبدارانہ، مخلصانہ اور محتاط مطالعہ قرآن کے ایک پر جوش طالب علم پر اس بات کا انکشاف کرتا ہے کہ:

(الف)۔ **الربا** کے بارے میں قرآنی احکامات کا مقصد انسانی لین دین میں ہر قسم کی ناانصافیوں کو دور کرنا ہے۔

(ب)۔ قرآن پاک میں **الربا** کی مکمل اور جامع تعریف کر دی گئی ہے اور پوری طرح سے اس کے تصور کو واضح کر دیا گیا ہے۔

(ج)۔ **الربا** کے بارے میں آیتوں کے احکام کی خلاف ورزی اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے اللہ اور اس کے رسول کے خلاف جنگ کہا ہے اور ان کی خلاف ورزی کرنے والوں سے جہنم کا وعدہ ہے۔

(د)۔ تاہم **الربا** کو سود کے مساوی قرار دے کر اس کے مفہوم کو صریحاً محدود اور غلط سمجھا گیا ہے۔

پس مسلمان خود بڑے پیمانے پر **الربا** کے بارے میں احکامات کی خلاف ورزی کر کے اللہ کے غیض و غضب کو دعوت دے رہے ہیں جس کی عکاسی موجودہ دور میں ان کے اپنے معاشروں میں خصوصاً اور ساری دنیا میں عموماً ان کی موجودہ قابل رحم حالت کرتی ہے۔

2۔ اسلام اور بینک کا سود۔ I

2.1۔ اسلامی دنیا کے اکثر مذہبی رہنما یہی فرماتے ہیں کہ اسلام میں وہ سود بھی حرام ہے جس کا لین دین بینک کرتے ہیں۔ وہ تو اس حد تک بھی چلے جاتے ہیں کہ بینک کے ملازمین جو تنخواہیں بینک سے حاصل کرتے ہیں وہ بھی ناجائز آمدنیاں ہوتی ہیں۔ ان رہنماؤں کا نقطہ نظر یہ ہوتا ہے کہ بینک کا سود بھی اسی الربا کے زمرے میں ہی آتا ہے جس کا ذکر سورہ البقرہ کی آیت نمبر 275 میں کیا گیا ہے۔

2.2۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جیسا کہ ہمارے مذہبی رہنما بڑا زور دے کر فرماتے ہیں کہ آیا بینک کا سود واقعی الربا ہے؟ جو بینک آج پائے جاتے ہیں ان کا وجود حضور ﷺ کے زمانے میں تو تھا نہیں اور جس آیت کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے وہ الربا کے حوالے سے حضرت محمد ﷺ پر نازل ہونے والی آخری آیتوں میں سے ایک آیت تھی جس کے بعد جلدی ہی حضور ﷺ کا وصال ہو گیا۔ ان حالات میں ہمارے پاس حضور ﷺ کی زبانی احادیث مبارکہ کی روشنی میں الربا کی ممانعت کے بارے میں تفصیلی احکامات جاننے کے ذرائع بھی محدود ہیں۔

2.3۔ ہاں البتہ ہمارے پاس اوپر بیان کی گئی آیت کے علاوہ قرآن پاک کی چھ اور آیات موجود ہیں جن میں صرف اور صرف الربا سے ہی بحث کی گئی ہے۔ ہمیں اس مقصد کے لئے ان ہی آیات کی طرف لوٹنا ہو گا۔

2.4۔ آیئے ایک شخص الف کی ایک بہت ہی عام سی مثال لیتے ہیں۔ الف اپنے 1000 روپے بینک کے بچت کھاتے میں جمع کرواتا ہے۔ اس سے اس کا مقصد اس رقم پر نفع کمانا نہیں ہے بلکہ وہ یہ رقم حفاظت کے نقطہ نظر سے رکھتا ہے۔ ایک سال کے بعد بینک خود ہی ایک تھوڑی سی رقم الف کے کھاتے میں سود کے نام سے جمع کر دیتا ہے جو فرض کریں 5 فیصد کے حساب سے شمار کیا گیا ہے۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ الف کے کھاتے میں کافی رقم جمع ہو گئی ہے بینک کا منیجر الف کو مشورہ دیتا ہے کہ وہ کچھ رقم میعادی کھاتے میں بھی جمع کرا دے جہاں سے اسے فرض کریں 10 فیصد سود مل سکتا ہے اور الف اس کے مشورے کو مان لیتا ہے۔ کیا یہ 5 فیصد یا 10 فیصد سود بھی الرِّبٰوا کے زمرے میں آئے گا۔ اور کیا وہ قرآنی حکم کو نہ ماننے کی پاداش میں مجرم شمار ہو گا جس کے خلاف اعلان جنگ کا کہا گیا ہے؟

2.5۔ اب ہم فرض کرتے ہیں کہ 1000 روپے کی رقم الف کے بچتی کھاتے میں ایک سال تک پڑی رہی۔ سال کے آخر پر سود شامل کرنے کے بعد یہ رقم بڑھ کر 1050 روپے ہو گئی۔ دوسری 1000 روپے کی رقم جو میعادی کھاتے میں رکھی گئی تھی بڑھ کر 1100 روپے ہو گئی۔ ایک سال بعد دونوں کھاتوں میں کل رقم 2000 روپے سے بڑھ کر کل 2150 روپے ہو گئی۔ لیکن الف جب غور کرتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ اسے تو فائدے کی بجائے گھاٹا ہو گیا۔ افراط زر کی وجہ سے اس کی قوت خرید ایک سال پہلے کی نسبت اب 15 فیصد کم ہو گئی ہے۔ جو اشیا وہ ایک سال پہلے 2000 روپے میں خرید تا تھا اب ان کی قیمت 2300 روپے ہو گئی ہے۔ اب اس لحاظ سے وہ کہتا ہے کہ بینک اسے اس حقیقی قوت خرید سے بھی کم دے رہا ہے جو اس نے ایک سال پہلے بینک کے پاس رکھ تھی۔ حقیقی قوت خرید کے اعتبار سے اسے تو اصل زر (Principal Amount) بھی واپس نہیں مل رہا کجا یہ کہ وہ زائد رقم (Interest) حاصل کرے۔

2.6۔ اب ہم سورہ البقرہ کی آیت نمبر 279 کی روشنی میں الف کے معاملے کو دیکھتے ہیں۔ یہ آیت کہتی ہے "فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا فَاۡذَنُوۡا بِحَرۡبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ ۚ وَ اِنۡ تُبۡتُمۡ فَلَکُمۡ رُءُوۡسُ اَمۡوَالِکُمۡ ۚ لَا تَظۡلِمُوۡنَ وَ لَا تُظۡلَمُوۡنَ" پھر اگر تم ایسا نہ کیا تو تیار ہو جاؤ لڑنے کے لئے اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اگر تم توبہ کر لو (اور الربا چھوڑ دو) تو تم حق دار ہو اصل مال کے نہ تم ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے۔ اس آیت کے اندر الربا لینے والوں کے لئے ایک سخت تنبیہ ہے۔ اللہ کہہ رہا ہے کہ جو لوگ الربا لینے سے باز آجائیں تو ان کے لئے ان کا اصل مال تو ہے جو ان کا حق ہے تا کہ نہ تو وہ کسی پر ظلم کریں اور نہ ان پر ظلم کیا جائے۔ پس قانون الٰہیہ کے تحت، جب بینک الف کو اصل مال (اصلی قوت خرید) 2300 روپے کی بجائے 2150 روپے دیتا ہے تو الف پر ظلم ہو رہا ہے۔ اس پر اور بھی ظلم ہوتا اگر بینک اسے 2000 روپے ہی دیتا۔

2.7۔ اس لئے ان حالات میں الف الربا لینے کا ہرگز مجرم نہیں ہو گا جب وہ بینک سے 2150 روپے لے گا۔ جو لوگ اسے گناہگار کہیں گے وہ خود اس پر جھوٹا الزام لگانے کے مجرم ہونگے اور وہ بھی اللہ کے نام کا سہارہ لیکر۔

2.8۔ اوپر والی مثال میں اگر بینک اسے 2300 روپے بھی دے دیتا تو کیا الف کو اس کے پورے واجبات جن کو لینے کی قرآن نے اجازت دی ہے اسے واپس مل جاتے؟ اس کا اب ذرا تفصیل سے جائزہ لیتے ہیں۔

2.9۔ جیسا کہ ہر شخص جانتا ہے 2000 روپے کی رقم جو الف نے بینک میں جمع کروائی تھی وہ یونہی بینک میں بے کار نہیں پڑی رہی۔ یہ ضرور کسی کو کاروبار کرنے یا کارخانہ لگانے کے لئے ادھار دی گئی ہو گی۔ بینک قرضے ایک متعینہ شرح سود پر لوگوں کو دیتے ہیں۔

2.10۔ کیا اس طرح سے سود لینا واقعی الربا کے زمرے میں آتا ہے؟ اس سوال کو مناسب انداز میں اور صاف طور پر سمجھنے کے لئے ہم اگلے باب میں علیحدہ سے غور کریں گے۔ تاہم یہ بات یہاں پر اچھی طرح سے ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ جو منافع بینک سال کے دوران کماتا ہے اس کا حساب لگانا اتنا آسان کام نہیں ہے بلکہ یہ ایک نہایت ہی پیچیدہ معاملہ ہے جس پر بہت سارے عوامل مثلاً نا قابل وصول قرضے، موجل وصولیاں، بینک کے اخراجات وغیرہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ ایک اچھا بینک بڑے محتاط انداز میں رقم ادھار دیتا ہے اور ادھار دینے سے پہلے اسے اس بات کا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ آیا ادھار لینے والا بینک کے تمام واجبات وقت پر ادا کرنے کے قابل اور با اعتماد ہے یا نہیں۔ اوسطاً اسے اچھا منافع کمانا چاہیئے ورنہ اس کی بقا خطرے میں پڑ سکتی ہے۔

2.11۔ اب فرض کریں کہ الف کا بینک مثال کے طور پر 3 فیصد اصلی اور خالص منافع کماتا ہے۔ پھر اوپر کئے گئے سوال کے جواب کو اچھی طرح سمجھنے کی غرض سے فرض کریں کہ بینک یہ منافع اپنے سارے فنڈز جو اسے دستیاب تھے اپنے کاروبار میں سرمایہ کاری کرنے کے بعد حاصل کر رہا ہے۔ اب یہ منافع کلیۃً ان خدمات کی وجہ سے نہیں ہے جو بینک نے سر انجام دیں۔ اس منافع کا کچھ حصہ اس سرمایے میں بھی جانا چاہیئے جو کھاتہ داروں کی رقوم پر مشتمل ہے کیونکہ اس سرمایے کے بغیر منافع کا حصول ممکن ہی نہیں تھا۔ پس قدرتی انصاف کے اصولوں کا تقاضا یہ ہے کہ الف کو اس کے پورے کے پورے واجبات علاوہ اس کی اپنی رقم مبلغ 2300 روپے کے ادا کئے جائیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا قرآنی قانون اس نتیجے کی توثیق کرتا ہے؟

2.12۔ ہم نے باب اول میں دیکھا تھا کہ سورہ الروم کی آیت نمبر 39 کی رو سے الربا سے مراد کسی شخص کا اپنی مادی دولت میں اضافے کی جھوٹی تسکین کی خواہش کو پورا کرنے کے لئے دوسرے لوگوں کے اموال (یعنی ان کی املاک، کمائیاں اور واجبات) کا غصب یا ہڑپ کرنا ہے۔ اب زیر نظر مثال میں عمومی شعور (Common Sense) ہمیں بتلا رہا ہے کہ الف کو اس منافع میں سے حصہ ملنا چاہیئے جو بینک کو حاصل ہوا ہے۔ منافع کا وہ حصہ جو الف کا جائز حق ہے بینک وہ حصہ اسے نہیں دے رہا۔ دوسرے الفاظ میں بینک الف کے جائز حق کو غصب کر رہا ہے۔ پس اس صورت میں بینک الف پر ظلم کر کے الربا لینے کا مجرم ہے اور الف سورہ البقرہ کی آیت نمبر 279 کے مطابق مظلوم۔ یہ ظلم تب ہی ختم ہو سکتا ہے جب بینک الف کو اس کا جائز حصہ دے۔

2.13۔ پس قرآنی منصوبہ کے مطابق الف کو بینک سے نہ صرف 2300 روپے (جو ایک سال پہلے جمع کروائی گئی امانت کی موجودہ قدر کے برابر ہیں) وصول کرنے چاہئیں بلکہ اس کو اس کے علاوہ اس منافع میں سے بھی حصہ ملنا چاہیئے جو بینک نے سال کے دوران کمایا۔

3۔ اسلام اور بینک کا سود۔II

3.1۔ الربا کی قرآنی تعریف کی واضح روشنی میں جو باب اول میں بیان کر دی گئی ہے آؤ ذرا اس بات کا جائزہ بھی لے لیں کہ آیا وہ سود جو بینک ایک خاص متعینہ شرح سے وصول کرتا ہے کیا وہ واقعی الربا ہے بھی کہ نہیں؟ دوسرے لفظوں میں ہمیں یہ دیکھنا ہو گا کہ آیا سود وصول کرکے بینک دوسروں کی جائز کمائیوں اور واجبات کو واقعی ہڑپ کر رہے ہیں؟ اس سوال کا جائزہ لیتے وقت یہ سادہ سی منطق بھی ہمارے سامنے رہنی چاہیئے کہ کوئی فرد یا ادارہ دوسرے لوگوں کی جائز کمائیوں اور واجبات کو اسی وقت غصب کرے گا جب وہ اپنے جائز حق سے ماورا رقوم کو غصب کرے گا۔

3.2۔ بینک عموماً کاروبار کے لئے ہی قرضہ دیتے ہیں۔ فرض کریں ایک شخص الف بینک سے ایک کروڑ روپے قرضہ حاصل کرتا ہے اور اسے وہ کسی کاروبار میں لگا دیتا ہے۔ اس کو نفع ہوتا ہے۔ اب یہ نفع الف کی صرف ان خدمات کی وجہ سے نہیں جو اس نے کاروبار کو چلانے میں صرف کیں بلکہ یہ نفع اس قرضے کی رقم کی وجہ سے بھی ہے جو اس نے بینک سے حاصل کیا۔ بغیر قرضے کے نہ تو کسی کاروبار کا تصور کیا جا سکتا تھا اور نہ ہی کسی نفع کا۔ اس لئے منطقی طور پر بینک بھی منافع میں ایک مناسب حصہ کا حق دار ہے۔ اگر شرح سود اس مناسب حصے کے اندر اندر ہو تو کسی طرف سے بھی کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔

3.3۔ لیکن پھر کیا ہو گا اگر (i) بینک کی شرح سود سارے کے سارے نفع کو ڈکار جائے، یا، (ii) نفع بینک کی شرح سود سے کم ہو، یا، (iii) نفع بالکل نہ ہو۔ اس قسم کے ناموافق حالات وقوع پذیر ہونے کے امکانات نے ہی شاید مذہبی رہنماؤں کو بینک کے سود پر الربا کی چھاپ لگانے کے لئے ابھارا ہے۔ لیکن کیا یہ چھاپ الربا کی قرآنی تعریف کے مطابق ہے؟

3.4۔ مناسب طور پر اس سوال کے جواب کو سمجھنے کے لئے پہلے ہمیں بینک کے کام کرنے کے طریقہ کار کی مبادیات سے اپنے آپ کو متعارف کروانا ہو گا۔ بینک چھوٹے بڑے صنعتی یا تجارتی کاروباروں کو سرمایہ مہیا کرنے کا کاروبار کرتے ہیں۔ بینک کا کاروبار ایک اہم کاروبار ہوتا ہے جس کے بغیر بہت سے دوسرے کاروباروں کے پہیئے رک جاتے ہیں یعنی ان کا چلنا بند ہو جاتا ہے۔

3.5۔ بینک خود یہ سرمایہ، بچت اور معینہ مدت کے امانتی کھاتوں سے حاصل کرتے ہیں جو لوگوں نے ان کے پاس کھولے ہوتے ہیں۔ ان کھاتوں اور امانتوں کی طرف لوگوں کو مائل کرنے کے لئے بینک ان پر سود کی پیشکش کرتے ہیں۔ انڈیا اور پاکستان جیسے ترقی

پذیر ممالک میں یہ شرح سود عموماً افراط زر کی شرح سے کم ہی دیکھی گئی ہے۔ بینک بہت بڑے تنظیمی ادارے ہوتے ہیں اور وہ اپنے کاروبار کو چلانے کے لئے بہت سے تنظیمی اخراجات بھی برداشت کرتے ہیں جیسے ملازمین کی تنخواہیں اور عمارتوں کے کرایے وغیرہ۔

3.6۔ اس لئے بینک ان تمام اخراجات کا بوجھ برداشت کرنے اور مناسب منافع کے حصول کے لئے قانونی طور پر اپنے قرضوں پر سود وصول کرتے ہیں۔ یہ مناسب نفع کامارجن ممکنہ حد تک کم سے کم ہی ہوناچاہیئے، کیونکہ بصورت دیگر قرضہ حاصل کرنے والوں کا دوسرے ایسے بینکوں کے پاس چلے جانے کا امکان ہو گا جو ان کو کم شرح پر قرضہ دینے کے لئے تیار ہوسکتے ہوں۔ اس تناظر میں چاہے کوئی اپنے تخیل میں جتنی مرضی اونچی پرواز کرلے یہ نہیں کہہ سکتا کہ بینک سود کے ذریعے سے جو رقوم حاصل کرتے ہیں وہ ان کی جائز کمائی یا جائز حق نہیں ہوتا۔ پس اگر انصاف کی نظر سے دیکھیں تو بینکوں پر دوسروں کی جائز کمائیوں یا جائز حقوق کو غصب یا ہڑپ کرنے کا الزام نہیں لگایا جاسکتا۔ دوسرے لفظوں میں قرآن کی روسے ان پر الربا لینے کا الزام ہر گز نہیں آتا۔

3.7۔ سو بینکوں پر الربا لینے کا الزام نہیں لگایا جاسکتا چاہے وہ انتہائی صورت بھی پیش آجائے جس میں ادھار لینے والے کو اپنے کاروبار میں نقصان اٹھاناپڑرہاہو۔ اس نقصان کا بینکوں کو ذمہ دار نہیں ٹھہرایاجاسکتا۔ کاروبار میں سرمایہ لگانے اور نقصان کا خطرہ مول لینے کی ساری ذمہ داری ادھار لینے والے کی ہی ہوتی ہے۔ بینک کو صرف اپنے کاروبار یعنی بینک کے کاروبار (Banking Business) سے غرض ہوتی ہے۔ باقی کاروباروں کی طرح بینک کو بھی اپنی خدمات کے صلے میں جو وہ باقی کاروباروں کو رقوم ادھار دے کر سرانجام دیتا ہے ایک مناسب نفع کے مطالبہ کا حق حاصل ہوناچاہیئے۔ جو رقم ادھار دی گئی، اخراجات جو اس نے برداشت کئے اور ایک مناسب منافع بینک کے قانونی واجبات ہیں جو ادھار لینے والے کے ذمہ ہوتے ہیں۔ ان قانونی واجبات سے انکار نہیں کیا جاسکتا چاہے ادھار لینے والے کو اپنے کاروبار میں نقصان ہی کیوں نہ اٹھانا پڑاہو۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک سٹیل فروخت کرنے والے کو ایک مکان بنانے والا ٹھیکیدار اس بناپر کہ جس مکان کے بنانے میں اس نے اسٹیل استعمال کیا تھا زمین بوس ہوگیا سٹیل کے واجبات اداکرنے سے انکار نہیں کرسکتا جو اس نے اس سے ادھار خریدا تھا۔ صاف ظاہر ہے اس میں سٹیل فروخت کرنے والے کا تو کوئی قصور نہیں تھا۔

3.8۔ پچھلے پیراگراف میں جو دلیل دی گئی ہے اس کو مزید تقویت قرآن پاک کی سورہ البقرہ کی آیت نمبر 279 سے ملتی ہے کیونکہ اس آیت میں کہا گیا ہے کہ جو لوگ الربا چھوڑ رہے ہیں وہ اپنے اموال یعنی اپنی جائز کمائی اور واجبات تو لینے کے حقدار ہیں۔ اس آیت سے یہ صاف ظاہر ہورہاہے کہ اپنی جائز کمائی اور واجبات کے حصول کا مطالبہ کرناہرگز الربا کے زمرے میں نہیں آتا، چاہے ادھار لینے والے کو نقصان ہورہاہو۔ یہاں پر ایسے معاملات میں البتہ قرآن ادھار دینے والے یعنی بینک کو کہہ رہاہے کہ ادھار لینے

والے کو واجبات کی واپسی کی ادائیگی میں ذرا اور وقت دے دو۔ تاہم ایسی انتہائی صورت میں جب ادھار لینے والا دیوالیہ(Bankrupt)ہونے جارہاہو تو قرآن ادھار دینے والے کو اپنے سارے واجبات(Dues) بھی معاف کرنے کا کہہ رہاہے (البقرہ:280)۔ ایک اچھی شہرت کا مالک بینک ہمیشہ یہی کرتا ہے ۔ وہ ایسے وقتوں کے لئے اس قسم کے قرضوں کو قلم زد (Write-off)کرنے کی گنجائش(Provision)ضرور رکھتے ہیں۔

3.9۔ اوپر کی تفصیلی بحث اور باب اول کے پیراگراف 1.7.11 سے 1.7.14 سے یہ بات پوری طرح سے واضح ہو چکی ہے کہ کہ بینک کا سود جس کا آج کل زیادہ لین دین ہے وہ قرآن کی رو سے الربا کے زمرے میں نہیں آتا۔ اسلام ایسے سود کے الربا کہنے کو ایک فریب (Fallacy) قرار دیتا ہے۔ لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ اسی فریب میں مستقل طور پر مبتلا ہمارے مذہبی رہنماہی پائے جاتے ہیں۔

4۔ایک مثالی اسلامی بینک

4.1۔ ہم جانتے ہیں کہ جدید دور میں بینکاری کاروبار ایک اہم کاروبار ہے۔ یہ کاروبار دوسرے کاروباروں کو کام کرنے کے لئے سرمایہ فراہم کرتا ہے جس کے بغیر کوئی کاروبار نہیں چل سکتا۔ اس جدید دنیا کا حصہ ہوتے ہوئے مسلمانوں کی بھی یہ بینکاری کاروبار ایک اہم ضرورت ہے۔ وہ صرف ایک خواہش کے طور پر اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔

4.2۔ پس ایک ایسی صورت حال ہونی چاہیئے جس میں ایک مسلمان ادارہ اپنے معاملات قرآنی قانون کے تحت رکھتے ہوئے ایک بینک چلا سکے۔ وہ ایسا کیسے کرے؟

4.3۔ سب سے پہلے تو ایسا ادارہ بڑے محتاط انداز میں اس چیز کی جانچ پڑتال اور پوری تحقیق کرے کہ آیا یہ اہم بینکاری کاروبار کہیں کسی بھی طور قرآنی قانون کے خلاف تو نہیں ہے؟ یہ کاروبار بنیادی طور پر دوسرے کاروباروں کو سرمایہ فراہم کرنے کے لئے خود سرمایہ اکٹھا کرتا ہے۔ عمومی شعور (Commonsense) یا قانون فطرت (Natural Law) تو اس میں کوئی چیز ایسی نہیں پاتے جو بذات خود کسی بھی لحاظ سے غیر اخلاقی یا غیر قانونی ہو۔ قرآنی قانون، قانون فطرت ہی تو ہے اور اس کے مطابق کوئی ایسا کاروبار کرنے کی ہرگز ممانعت نہیں ہے بشرطیکہ وہ دوسرے ایسے کاروباروں کو رقوم فراہم نہ کرتا ہو جو اسلامی نقطہ نظر سے غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث ہوں جیسا کہ شراب کی تیاری وغیرہ۔

4.4۔ ہر کاروبار ایک مناسب معاوضہ کے عوض اشیاء و خدمات کی فروخت یا تبادلے کا کام کرتا ہے۔ بینکاری کاروبار بھی لوگوں سے رقوم اکٹھی کرکے اور پھر انہیں دوسرے کاربارو ں کو مہیا کرکے اپنی خدمات ایک مناسب معاوضے کے عوض بیچتا یا تبدیل کرتا ہے۔ ایسی فروخت یا مبادلہ کو عربی میں **بیع** کہتے ہیں اور **بیع** کو قرآن پاک خاص طور پر ایک جائز سرگرمی اور **الربا** کو ممنوع قرار دیتا ہے (البقرہ:275)۔ جیسا کہ ہم نے پچھلے ابواب میں دیکھا ہے **الربا** ظالمانہ طور پر دوسروں کے جائز اموال (املاک، واجبات اور کمائیوں) کو ہڑپ کرنے کا نام ہے۔

4.5۔ سو ایک صحیح اور سچے اسلامی ادارے کو خود ایک بینک چلانے میں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیئے اگر وہ (الف) اپنے دستور میں اپنے آپ کو اس بات کا پابند بنالے کہ وہ کسی ایسی سرگرمی کے لئے رقم ادھار نہیں دے گا جو اسلام میں ممنوع ہو مثلاً جوا خانے یا شراب خانے کھولنے یا ان کو چلانے کے لئے اور اسی طرح شراب کے بنانے اور اس کو فروخت کرنے کے لئے وغیرہ وغیرہ، اور وہ

(ب) سختی سے الربا کے بارے میں قرآنی حکم پر عمل کرے گا یعنی کسی بھی صورت میں ظالمانہ طور پر کسی بھی شخص کی جائز کمائیوں اور واجبات کو ہڑپ نہیں کرے گا۔

4.6۔ پس اسلامی بینکنگ کے ادارہ کو اپنے کھاتہ داروں اور امانتیں رکھانے والوں سے رقوم اکٹھی کرنے کے بارے میں ایک بڑی واضح پالیسی وضع کرنی پڑے گی جس کے مطابق ادارہ بڑی سختی کے ساتھ اوپر بیان کردہ شرط (ب) کی پابندی کرے گا اور کھاتہ داروں اور امانت رکھانے والوں کو ان کے جائز واجبات کی ادائیگی بروقت کرے گا۔ اس سے پہلے ادارہ بڑی احتیاط کے ساتھ اس بات کا تعین بھی کرے گا کہ اس کے ان کھاتہ داروں اور امانت رکھانے والوں کے جائز واجبات کون کون سے ہیں۔

4.7۔ فرض کیا ایک امانت رکھانے والا الف نامی شخص 2 لاکھ روپے ایک سال کی مدت کے لئے اسلامی بینک میں جمع کرواتا ہے۔ (یہاں ہمارا واسطہ اس سوال سے نہیں ہے کہ آیا یہ بینک ایسی رقم جمع کروانے کے لئے صرف مسلمان کے لئے اسلامی ہے۔ اس سوال کا جائزہ ہم اگلے باب میں لیں گے۔) اگر بینک سال کے آخر پر بالکل اتنی ہی رقم الف کو ادا کرتا ہے تو آج کی دنیا کے حالات کے تناظر میں الف پر ظلم ہو گا۔ کیونکہ افراط زر کی وجہ سے الف کو یہ معلوم ہے کہ اس رقم کے ساتھ وہ آج جتنی اشیاء خرید سکتا ہے وہ ان اشیاء کی مقدار سے کم ہے جو وہ پچھلے سال اسی رقم کے ساتھ خرید سکتا تھا۔ قانون قرآنی کی رو سے وہ صرف رقم نہیں بلکہ اپنے اموال (اشیاء یا واجبات) واپس لینے کا پوری طرح سے حق دار ہے (البقرہ:279)۔ رقم تو صرف اشیاء کی موجودہ قدر کو ماپنے کی ایک علامت ہے؛ یہ بذات خود کوئی شے نہیں ہے جس کو اموال کہا جا سکے۔

4.8۔ جو نقطہ پچھلے پیرے میں اٹھایا گیا تھا اسی کو مزید واضح کرنے کے لئے، فرض کریں ب، ج کو ایک سال کے استعمال کے لئے ایک نئی کار دیتا ہے جس کی مالیت 2 لاکھ روپے ہے۔ قرآنی قانون کے مطابق ج نے ایک سال کے بعد بالکل ویسی ہی نئی کار ب کو واپس لوٹانی ہے نہ کہ استعمال شدہ کار۔ اب ج نے ایک نئی کار ب کو دینے کے لئے خریدنی ہے جس کی موجودہ بازاری قیمت 2 لاکھ 20 ہزار روپے ہو گئی ہے یعنی ایک سال بعد کار کی قیمت میں 20 ہزار روپے کا اضافہ ہو گیا ہے۔ متبادل کے طور پر قرآنی قانون پر عمل کرنے کے لئے ج، ب کو 2 لاکھ 20 ہزار روپے دے سکتا ہے، چاہے ایک سال پہلے ب نے کار 2 لاکھ روپے میں خریدی تھی۔ اگر ب کو 2 لاکھ 20 ہزار روپے سے کم کی ادائیگی کی جائے گی تو ب پر ظلم ہو گا اور اگر 2 لاکھ 20 ہزار روپے سے زیادہ کی ادائیگی کی جائے گی تو ج پر ظلم ہو گا۔ قرآن سورہ البقرہ کی آیت نمبر 279 میں ادھار دینے والے کو صاف طور پر بتا رہا ہے کہ لَا تَظْلِمُوْنَ وَ لَا تُظْلِمُوْنَ یعنی نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تجھ پر ظلم کیا جائے۔ اس مثال سے اسلامی یا قرآنی قانون کی پوری پوری وضاحت ہو گئی۔

4.9۔اب ہم واپس اسی مثال کی طرف لوٹتے ہیں جس میں **الف** نے 2 لاکھ روپے اسلامی بینک میں ایک سال کے لئے جمع کروائے تھے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کہ **الف** نے اشیاء(اموال) جمع کروائے ہوں جن کی جمع کرواتے وقت موجودہ مالیت 2 لاکھ روپے ہو۔ ایک سال کے بعد **الف** اتنی ہی اشیاء(مقدار اور کوالٹی دونوں)کا حق دار ہو گا۔اب اگر اتنی ہی اشیاء 2 لاکھ 20 ہزار روپے میں آتی ہوں، تو اسلامی بینک کو 2 لاکھ اور 20 ہزار روپے **الف** کو دینے ہونگے۔ عملی طور پر اسلامی بینک کو پوری طرح سے اس بات کا تعین کرنا ہو گا کہ اب وہ کتنی رقم ہے جو ایک سال پہلے کے 2 لاکھ روپے کے برابر ہو گی۔اس کا حساب وہ اشیاء کے اوسط قیمتی اشاریے (Average Price Index of Goods) کی بنیاد پر لگا سکتا ہے۔اگر اس بنیاد پر مالیت 2 لاکھ کی بجائے 2 لاکھ 20 ہزار روپے بنے تو بینک **الف** کو 2 لاکھ 20 ہزار روپے ہی لوٹائے گا۔یہی اس کے اصلی (Original) اموال ہوں گے۔ اس باب کے آخر میں ہم دیکھیں گے کہ آیا اس رقم میں **الف** کے سارے کے سارے جائز واجبات (Rightful Dues) شامل (Cover) ہو جاتے ہیں یا کہ نہیں۔اس فرق کو جو دونوں رقموں کے درمیان (یعنی جو رقم سال کے آخر پر **الف** کو ادا کی گئی اور وہ رقم جو **الف** نے سال کے شروع میں جمع کروائی تھی) بنتا ہے بینک اسے اخراجات کے کھاتے (Expenditure Head of Account) میں ڈال سکتا ہے۔

4.10۔اسلامی بینک بھی دوسرے بینکوں کی طرح جو فنڈز اس نے اکٹھے کئے ہیں ان کو دوسرے کاروباروں کو مہیا کرے گا۔ فنڈز کے اکٹھا کرنے، بہت سے کھاتوں کی دیکھ بھال، سابقہ تجربات کے محتاط اور باریک بین تجزیے اور ادھار لینے والے اشخاص اور اداروں کی ساکھ کے بارے میں معلومات اکٹھا کرنے پر بڑی بھاری رقوم خرچ کرنا پڑتی ہیں۔اس کے علاوہ بینک ملازمین کی تنخواہوں، دفتر کے لئے حاصل کی گئی عمارات کے کرایوں اور ناقابل وصول قرضہ جات پر بھی اخراجات آتے ہیں۔ صاف ظاہر ہے ان سب اخراجات کو قرضہ لینے والے اشخاص اور اداروں سے تناسب کے حساب سے ہی وصول کیا جاتا ہے۔اس کے علاوہ اسلامی بینک بھی دوسرے بینکوں ہی کی طرح ایک مناسب خالص شرح منافع کا حقدار ہوتا ہے جو عموماً 2 یا 3 فیصد کے قریب ہوتی ہے—— یہ منافع کا قاعدہ اسلام میں کسی بھی قانونی کاروبار (**بیع**) کے لئے تسلیم شدہ ہے۔یہ اخراجات جو بینک برداشت کرتا ہے مشمولہ قانونی منافع کے بینک کی شرح سود جو وہ وصول کرتا ہے کا تعین کرتے ہیں۔

4.11۔جیسا کہ ہم نے اوپر دیکھا ہے **الربا** دوسرے لوگوں کے جائز واجبات اور کمائیاں ظالمانہ طریقے سے غصب کرنے کا نام ہے۔سود بینک کے جائز واجبات اور کمائی پر مشتمل ہوتا ہے۔ایسے سود کو ہم قرآن کی روسے **الربا** کا نام نہیں دے سکتے لیکن بدقسمتی سے ہمارے سارے مذہبی قائدین اس کو **الربا** ہی کہتے ہیں۔ایسے قائدین کے لئے سود کا لفظ شجر ممنوعہ کی طرح ہے۔وہ بغیر سوچے سمجھے اور بلا امتیاز اس کو **الربا** کے مترادف ہی سمجھتے ہیں اور اسلام کے بے لاگ اور بے عیب نام کو متنازعہ بناتے ہیں۔

4.12۔اب یہ 2 یا 3 فیصد مناسب منافع جو اسلامی بینک کمائے گا بلاشبہ یہ ان خدمات کا معاوضہ ہو گا جو بینک سر انجام دیتا ہے۔ لیکن یہ منافع ان فنڈز کے بغیر ممکن نہیں ہو سکتا جو بینک کے کھاتہ دار اور مدتی ضمانتیں رکھوانے ولے اپنی رقوم بینک کے پاس جمع رکھتے ہیں۔ اس لئے اسلامی بینک کا یہ فرض بنے گا کہ وہ اس منافع میں سے ایک مناسب حصہ اپنے کھاتہ داروں اور ضمانت رکھوانے والوں کو دے بصورت دیگر وہ اپنے کھاتہ داروں کے جائز واجبات غصب کرنے کا مجرم بنے گا اور الربا لینے کا مرتکب ٹھہرے گا۔ اگر خالص منافع فرض کریں 3 فیصد ہے تو اس کی مناسب تقسیم یہ ہو سکتی ہے کہ بینک 1 فیصد کھاتہ داروں کو دے دے اور باقی کا 2 فیصد اپنے پاس رکھ لے۔ اسلامی بینک اس کا طریق کار طے کر سکتا ہے کہ 1 فیصد منافع کو وہ اپنے کھاتہ داروں کو حصص (Dividend) کی صورت میں ادا کر دے۔ تاہم یہ (Dividend) ضمانت رکھوانے والوں کے اصلی اموال (جو بینک نے ان کو واپس کرنے ہیں) کے علاوہ ہونگے۔

4.13۔اسلامی بینک کو اپنے ملازمین کے لئے ایک ماڈل آجر (مالک) کا کردار ادا کرنا چاہیئے۔ اسے اپنے ملازمین کو اس اقتصادی ماحول کے مطابق اجرت دینی چاہیئے جس میں وہ رہ رہے ہوں تاکہ تھوڑی اجرت لینے والا ملازم بھی اپنی کم سے کم بنیادی ضروریات پوری کرنے کے قابل ہو۔ بینک کو اس بات کا پورا پورا احساس ہونا چاہیئے کہ اگر وہ اپنے ملازمین کو ان کے جائز واجبات نہ دے سکا تو وہ الربا میں ملوث ہونے کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ اوپر پیرا گراف 1.6.3 میں کہا جا چکا ہے کہ صدقات کا ادا کرنا معاشی طور پر کھاتے پیتے ہر مسلمان کا فرض ہے۔ یہ مسلمانوں کے کارپوریٹ اداروں پر بھی جو اپنا کاروبار کامیابی سے چلا رہے ہوں اتنا ہی لازم ہے کہ وہ بھی صدقات کی ادئیگی کریں۔ اسلامی بینک پر بھی یہ صدقات کا دینا فرض ہو گا۔ ایسے بینک کو لازمی طور پر صدقات ادا کرنے چاہئیں اور ان کو چاہیئے کہ وہ اپنے نفع میں سے ایک مخصوص حصہ صدقات اور معاشرے کی فلاح و بہبود کے لئے مختص کر دیں۔

4.14۔ہونہار سائنسدانوں، انجینئرز اور آجریا کاروباری حضرات (Entrepreneurs) کی حوصلہ افزائی کے لئے، ماڈل اسلامی بینک کو اپنے فنڈز کا ایک حصہ Venture Capital Fund کی صورت میں ایک طرف نکال کر رکھ لینا چاہیئے۔ ایسے کاروباری لوگوں کے منصوبوں کو اس فنڈ سے فنانس کرنا چاہیئے۔ اگر ایسی Venture منافع کمائیں تو اس کا ایک مناسب حصہ سائنسدانوں اور بینک کو بھی جانا چاہیئے۔ اگر بالفرض Venture ناکام ہو جائے تو سارا نقصان بینک کو برداشت کرنا چاہیئے جبکہ آجر حضرات اپنی محنت اور وقت جو انہوں نے لگایا ضائع کریں گے۔ اس طرح کی کیپیٹل ونچر فرمیں (Capital Venture Firms) امریکہ میں بڑی کامیاب ہیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ ایسی فرمیں دوسرے ملکوں میں کامیاب نہ ہوں بشرطیکہ فنڈنگ منصفانہ ہو۔ ایسے ہونہار آجر جن کے پاس فنڈز کی کمی ہوتی ہے اس طریقہ سے بڑے موثر انداز میں ان کی حوصلہ افزائی ہو گی اور معاشرہ بھی ان کے تخلیقی تصورات سے مستفید ہو گا۔

5۔ فرد، بدوں الربا

5.1۔ جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں قرآن میں الربا لینے کی بڑی سختی کے ساتھ مذمت کی گئی ہے۔ الربا لینے والے کو تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ جنگ کر رہا ہے (البقرہ:279)۔ اگر کوئی بھی اللہ، اس کے رسول ﷺ اور آخرت پر ایمان رکھنے والا سچا مسلمان ہو گا تو اسے اس تنبیہ کو ضرور سنجیدگی سے لینا ہو گا اور بڑی احتیاط کے ساتھ الربا پر دھیان دے کر پوری ذمہ داری اور توجہ کے ساتھ اس سے گریز کرنا ہو گا۔

5.2۔ الربا جیسا کہ خود قرآن میں واضح کر دیا گیا ہے، دوسروں کے جائز واجبات اور کمائیوں کو ظالمانہ طور پر ہڑپ کرنے کا نام ہے (الروم:39)۔ اس لئے ہر سچے مسلمان کو اپنی ساری زندگی میں کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیئے جس کے نتیجے میں وہ دوسروں کی جائز کمائیوں اور واجبات کو غیر منصفانہ یا غیر قانونی طریقے سے ہڑپ کرے۔

5.3۔ عموماً جو لوگ خط غربت سے نیچے زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں وہی الربا کے ظلم کا نشانہ بنتے ہیں؛ ان کی طرف سے دوسرے لوگوں کی جائز کمائیوں اور واجبات ہڑپ کرنے کے امکانات بہت ہی کم ہوتے ہیں، البتہ اگر وہ چوری، ڈاکہ اور دھوکہ دہی اختیار نہ کرلیں۔ چوری اور ڈاکہ الربا کے تحت نہیں آتے کیونکہ قرآن پاک کی رو سے الربا میں دوسروں کے جائز واجبات غصب یا ہڑپ کرنے کے لئے پہلے اپنے پلے سے کچھ دینا پڑتا ہے (الروم:39)۔ چوری اور ڈاکہ کی صورت میں ظلم کا نشانہ بننے والے کو کچھ نہیں دیا جاتا۔ اس لئے قرآنی اصطلاح میں ایسے جرائم الربا کے جرم سے بالکل مختلف ہوتے ہیں اور اسی لئے یہ اس کتاب کے دائرہ کار میں نہیں آتے۔

5.4۔ لیکن دھوکہ دہی کی کچھ صورتیں ایسی بھی ہو سکتی ہیں جو الربا کے تحت آسکتی ہیں۔ فرض کریں ایک گھر گھر پھر کر چھوٹی موٹی اشیاء فروخت کرنے والا سیلز مین ایک سادہ گھریلو خاتون کو ایک نئی شے 200 روپے میں فروخت کرتا ہے، جبکہ وہی شے بازار میں کھلے بندوں 80 روپے میں دستیاب ہے۔ یہاں پر سیلز مین واضح طور پر دھوکہ دے کر الربا میں ملوث ہو رہا ہے (یعنی زیادہ قیمت وصول کر رہا ہے)۔ یا پھر اگر ایک گھریلو خاتون الف اپنی ہمسایہ خاتون ب سے ایک گھریلو آئٹم مثلاً چائے کی ڈبیا ادھار لیتی ہے۔ الف کو یہ معلوم ہے کہ ب امیر ہوتے ہوئے مہنگی چائے استعمال کرتی ہے لیکن جب وہ چائے واپس کرتی ہے تو وہ ب کو وہ گھٹیا چائے واپس کر دیتی ہے جسے وہ خود استعمال کرتی ہے۔ یہ کرتے ہوئے الف، الربا کا ارتکاب کر رہی ہے؛ کیونکہ ب چائے کی وہی مقدار اور

کو الٹی واپس لینے کی حق دار ہے جو اس نے ادھار دی تھی۔ اگرچہ ہو سکتا ہے اس قسم کے لین دین میں جان بوجھ کر دھوکہ نہ دیا جارہا ہو لیکن اس میں الربا کا عنصر ضرور شامل ہو جاتا ہے۔

5.5۔ پھر ایک اور معاملہ ٹیکسی ڈرائیور کا بھی ہو سکتا ہے جو منزل پر پہنچ کر مسافر سے اس رقم سے زیادہ رکا مطالبہ کر رہا ہو جو میٹر ظاہر کر رہا ہے جس کے لئے اس نے یا تو بڑی ہنر مندی سے میٹر میں ردوبدل کر لیا ہو یا اور کوئی بہانہ بنا کر زیادہ رقم بٹورنے کی کوشش میں لگا ہو۔ تجربہ کار اور سخت گیر مسافر تو اس کے اس غیر قانونی مطالبے پر ضرور مزاحمت کریں گے اور صحیح کرایہ ادا کرنے پر ہی اصرار کریں گے لیکن ہو سکتا ہے دوسرے لوگ جن کا اتنا مضبوط ارادہ نہ ہو اور وہ اس بے ڈھنگے ٹیکسی ڈرائیور کے کوئی تماشہ کھڑا کرنے کے ڈر سے اس کر ساتھ تو تو میں میں، میں بھی الجھنا نہ چاہتے ہوں اس مطالبے کو تسلیم کر لیں۔ ایسی صورت میں اپنے حق سے زیادہ رقم بٹور کر ٹیکسی ڈرائیور الربا لینے کا مرتکب ہو رہا ہے۔

5.6۔ ایسی صورتوں میں جو اوپر بیان کی گئی ہیں ہو سکتا ہے الربا کے مرتکب مجرموں کے پاس اپنی غربت کا جواز موجود ہو اور وہ یہ دلیل پیش کریں کہ جن لوگوں کے پاس آگ لگائے دولت ختم نہیں ہوتی اگر ہم نے ان سے تھوڑی زیادہ رقم لے لی ہے تو کون سی قیامت آگئی۔ لیکن ایسا جواز اور دلیل پیش کرنے والے غلطی پر ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس طرح الربا کا نشانہ بننے والے سارے لوگ ایسے نہیں ہوتے جن کے پاس آگ لگائے بھی دولت ختم نہ ہو۔ اگر کچھ لوگوں کے پاس آگ لگانے کے لئے اتنی دولت موجود بھی ہو، تو اسلام اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ شک وشبہ سے بالاتر اچھے مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے بھی غیر قانونی اور غیر اخلاقی ذرائع استعمال کئے جائیں، کجا یہ کہ ان کو مشکوک مقاصد کے لئے استعمال میں لایا جائے۔ اگر ایک سچا مسلمان بہت سی مشکلات اور دشواریوں میں بھی گھر جائے تب بھی اس کو اس بات کا پورا یقین ہونا چاہیئے کہ اگر وہ صحیح راستے پر ثابت قدی سے قائم رہا تو بالآخر ان دشواریوں اور مشکلات کا انعام اسے ضرور مل کر رہے گا۔ "فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَ اتَّقٰی۔ وَ صَدَّقَ بِالْحُسْنٰی۔ فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْیُسْرٰی۔" (اللیل:95 تا 97)۔ سو جس نے دیا (مال اللہ کے راستے میں) اور ڈرتا رہا اور سچ مانا بھلائی کو سو ہم اس کے لئے آسانی کے راستے کو آسان بنادیں گے۔ سو ایک ایسا شخص جس کی سانسوں میں بھی الربا کی نفرت بسی ہو ایسی حرکتیں کبھی نہیں کرے گا جو الربا پر منتج ہوں چاہے وہ کتنی ہی مشکلات میں گھرا ہوا کیوں نہ ہو۔

5.7۔ آیئے اب ہم الربا کے مقابلے پر ان لوگوں کے طرز زندگی پر نظر دوڑائیں جو خط غربت سے اوپر ہوتے ہیں یا یوں کہہ لیجئے کہ جن کے پاس دولت آگ لگائے ختم نہیں ہوتی۔ ایسے ہی لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ بار بار قرآن پاک میں اللہ کے راستے میں دینے یا خرچ کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ قرآن سورہ الروم (آیت نمبر 39) میں زکٰوۃ دینے والوں کے اجر کو ان کے اموال میں اضافے سے

موسوم کرتا ہے۔ اموال میں اضافے کے اس اجر کی توقع صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی سے کی جاسکتی ہے۔ دوسری طرف اگر اس نیت سے دیا جائے کہ (جس کو دیا گیا ہے اس سے) اپنے جائز حق سے زیادہ وصول کرنا ہے، تو اللہ اسی آیت میں فرماتے ہیں کہ دولت میں اس طرح کا اضافہ اللہ کے ہاں اضافہ نہیں ہے بلکہ دھوکہ اور فریب ہے۔

5.8۔ محولہ بالا آیت کی پوری پوری اہمیت کو سمجھنے کے لئے آؤ دیکھیں کہ اگر کوئی شخص قرآنی تلقین پر عمل نہیں کرتا تو کیا ہوتا ہے۔ وہ فالتو رقم جو آدمی کے پاس ہوتی ہے غیر ضروری اشیاء کے خریدنے میں صرف ہو جاتی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے من میں شجر ممنوعہ چکھنے کی خواہش پیدا ہو اور وہ بے سوادی عادات اختیار کرلے اور وقت کے ساتھ ساتھ وہ اور اس کا گھرانہ رنگ رلیاں منانے کے عادی ہو جائیں۔ یہ بالکل منشیات کے عادی لوگوں کی طرح ہی ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے سارا گھرانہ شاپنگ کے لئے دوبئی یا سنگاپور جانے کی تیاری کرنے لگے اور پھر پتہ چلے کہ ان اضافی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے جو رقم ان کے پاس موجود ہے وہ اس مقصد کے لئے ناکافی ہے۔ ان کے پاس تو اپنی خوہشات کی مکمل تسکین کے لئے زیادہ رقم ہونی چاہیئے۔

5.9۔ سو ایسی صورت حال میں مزید رقم حاصل کرنے کے لئے آدمی کیا کرے گا؟ جو آمدنی ٹیکس اور دوسرے محصولات وہ حکومت کو دے رہا تھا، اب اس کے لئے یہ سب بوجھ بن جائیں گے۔ وہ اپنے ساتھ ہی بحث کرنے لگے گا کہ " میں اپنی محنت سے کمائی ہوئی دولت حکومت کو کیوں دوں جبکہ میرے ہی جیسے دوسرے لوگ ان ٹیکسوں اور محصولات کو مختلف حیلے بہانے بنا کر ادا کرنے سے گریزاں رہتے ہیں۔ میں بھی اگر تھوڑی سی رقم دے کر متعلقہ افسروں کی جیب گرم کردوں تو ٹیکسوں کی ادائیگی میں سے کافی پیسہ بچا سکتا ہوں "۔ پس آدمی غیر قانونی ہتھکنڈے استعمال کرکے خود ہی ان اموال کو ہڑپ کرنے لگتا ہے جو جائز طور پر حکومت کو واجب الادا ہوتے ہیں۔ اس طریقے سے وہ قرآنی اصطلاح میں الربا لینے کا مرتکب ہو جاتا ہے۔

5.10۔ آدمی یہیں پر بس نہیں کرتا اور وہ اب بس کر بھی نہیں سکتا۔ اسے زیادہ سے زیادہ رقم چاہیئے۔ وہ اپنی فیکٹری میں پیداوار کو دوگنا کر دیتا ہے اور اپنے منافع کو بڑھانے کے لئے اخراجات میں اضافہ کو کم سے کم رکھنے کے لئے عملے کی تنخواہوں میں اضافہ نہیں کرتا جو کہ اصولاً اسے کرنا چاہیئے۔ اس کے لئے وہ بڑی ہوشیاری سے کھاتوں میں گڑبڑ بھی کرتا ہے اور دوسرے بہت سے ایسے طریقے بھی اختیار کرتا ہے کہ عملے کو اس کی سوں بھوں ہی نہ لگے کہ ان کے جائز واجبات کو چھپا کر ان کو دھوکہ دیا جارہا ہے۔ بہر حال وہ ان کے جائز واجبات کو ظالمانہ طور پر ہڑپ کرنا شروع کر دیتا ہے اور دوبارہ الربا لینے کا مرتکب ہو رہا ہوتا ہے۔

5.11۔ یہ الربا کا ارتکاب آدمی بڑی سنگ دلی کے ساتھ جاری رکھتا ہے۔ وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اس کے بغیر چارہ کار نہیں ہے۔ پھر وہ رخ بدل کر اس نقطہ نظر کا حامی نظر آنے لگتا ہے کہ کوئی آدمی اس دنیا میں ایمان دار اور مخلص رہ کر ترقی نہیں کر سکتا اور پھر اسی قسم کے غیر سنجیدہ اور فضول خیالات کی تبلیغ اوروں کو بھی کرنے لگ جاتا ہے۔

5.12۔ لیکن ایسی غلط راہوں پر ایک عرصہ تک بھٹکنے کے بعد اچانک اس کی بداعمالیاں آکر اسے گھیر لیتی ہیں اور ایک ناگہانی حادثے سے وہ بری طرح دوچار ہو جاتا ہے۔ کچہری میں ایک لمبے عرصے تک جاری رہنے والی قانونی جنگ آخر کار ٹیکس چوری کی پاداش میں اس کی سزا پر منتج ہوتی ہے۔ بھاری جرمانہ کے ساتھ اس کو جیل بھیج دیا جاتا ہے۔ فیکٹری کا عملہ یہ جان کر کہ لمبے عرصہ تک انہیں دھوکا دیا جاتا رہا ہے اور انہیں ان کے جائز واجبات ادا نہیں کئے جاتے رہے ہڑتال پر چلا جاتا ہے۔ بہت سی آفتیں ایک لشکر کی صورت میں اس پر حملہ کر دیتی ہیں اور وہ اپنی مالی تباہی کی مکمل گرفت میں آجاتا ہے۔

5.13۔ اب یہ بات اس پر کھلتی ہے کہ الربا لے کر جو اضافہ اس نے اپنی دولت میں کرنا چاہا وہ طویل عرصہ میں حقیقتاً اضافہ ہے ہی نہیں بلکہ اس سے تو الربا میں ملوث ہونے سے پہلے جو کچھ بھی اس کے پاس موجود تھا وہ بھی تباہ و برباد ہو گیا۔ یہ بات اب اس کی سمجھ میں آئی ہے کہ اگر وہ فالتو رقم خیرات کر دیتا جو اس نے اپنے لئے اور اپنے گھرانے کے لئے غیر ضروری اشیاء کے خریدنے پر صرف کی وہ کبھی بھی ایسی صورت حال سے دوچار نہ ہوتا۔ لیکن بہت دیر ہو چکی اب کچھ نہیں ہو سکتا۔

5.14۔ کہا جا سکتا ہے کہ جو منظر کشی اوپر کی گئی ہے وہ بہت زیادہ سادگی پر مبنی ہے۔ جن لوگوں (اس کے بعد اب ہم ایسے لوگوں کے لئے ظالموں کا لفظ استعمال کریں گے) کا طرز زندگی ایسا ہوتا ہے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے حقیقی زندگی میں ان کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا۔ شاید کچھ ظالموں کے ساتھ ایسا ہو بھی جاتا ہو مگر اکثر کو ایسے نتائج و عواقب کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ ہاں یہ درست ہو سکتا ہے، کیونکہ اگر سارے ظالموں کو ایسے ہی برے نتائج و عواقب بھگتنے پڑتے جن کو ہر شخص مشاہدہ کر سکتا پھر تو کوئی بھی ظالم ظلم کرنے کی ہمت ہی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ ظالموں کی ظاہری خوشحالی ہی ہوتی ہے جو دوسرے لوگوں کو ان کے نقش قدم پر چلنے کے لئے اکساتی ہے۔ اور اسی میں وہ الٰہی ٹیسٹ مضمر ہے جس کے بغیر انسانی زندگی بے مقصد نظر آتی ہے۔

5.15۔ لیکن ظاہری خوشحالی کا مطلب ہر گز یہ نہیں ہوتا، کہ ظالموں کو حقیقی خوشی بھی نصیب ہوتی ہے۔ باوجود کروڑ پتی اور اکثر کو صرف کروڑ پتی ہونے کی وجہ سے، لگاتار ایک کے بعد دوسری فکر لاحق رہتی ہے۔ بنیادی طور پر تو آدمی کو خوشحالی کی تلاش، خوشی حاصل کرنے کے لئے ہی ہوتی ہے۔ لیکن بغیر خوشی کے خوشحالی بھی بے معنی ہو جاتی ہے۔ بہ ایں ہمہ کچھ ظالموں کا حشر تو اسی دنیا میں ہی ایسا ہو جاتا ہے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا تاکہ ایسے ظالموں کو جو اپنے ظلم کی ساری حدیں پھلانگ چکے باقی لوگوں کے لئے نشان

عبرت بنا دیا جائے اور باقی لوگ ان کو دیکھ کر سبق حاصل کریں۔ لیکن تمام ظالموں کو لازمی طور پر اپنے ظلم کی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے چاہے آخرت میں ہو چاہے آخرت کے ساتھ ساتھ اس دنیا میں بھی۔

5.16۔ پس ہمارے بدون الربا آدمی کو، اگر وہ خط غربت سے اوپر ہے، ظالموں جیسا طرز زندگی نہیں اپنانا چاہیئے۔ اسے چاہیئے کہ وہ فرض سمجھ کر زکوٰۃ اور صدقات ادا کرے، ایمان داری کے ساتھ اپنے ٹیکس دے، بڑی احتیاط کے ساتھ اپنے ملازمین کے جائز واجبات ادا کرے اور مسلسل اللہ سے دعا کرتا رہے کہ شیطان اسے برائی یا الربا کی کسی بھی صورت کی طرف راغب نہ کر دے۔ اگر پھر بھی اس کے پاس کچھ رقم بچ جائے جس کی اسے فوری ضرورت نہ ہو بلکہ اس کی اسے مستقبل میں ضرورت پڑ سکتی ہو تو اسے وہ اپنے گھر پر غلے میں جمع رکھنے کی بجائے کسی بینک کی نزدیکی شاخ میں جمع کروادے۔ اس طرح سے وہ اپنی بچی ہوئی رقم کو دوسرے کاروباروں کو مہیا کر کے ملکی ترقی میں اپنا کردار بھی ادا کر سکتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنی رقم کو محفوظ بھی بنا سکتا ہے اور بعد میں جب ضرورت پڑے تو اس کو اپنے استعمال میں بھی لا سکتا ہے۔

5.17۔ اور اگر نزدیک میں کوئی اسلامی بینک نہ ہو تو پھر مشکل پیش آسکتی ہے۔ اس صورت میں کیا گھر پر ہی رقم بے کار پڑی رہنے دی جائے اور اس کی حفاظت کے خطرات بھی اٹھائے جائیں؟ یا پھر وہ رقم کسی اچھی شہرت کے مالک بینک میں جمع کروادی جائے جو اپنے فنڈز اخلاقی طور پر اچھے کاروباروں کو بھی قرض دیتے ہوں اور ایسے کاروباروں کو بھی جو شراب بنانے اور بیچنے کا کاروبار کرتے ہوں جو کہ اسلام میں غیر اخلاقی کاروبار ہیں؟ میرے خیال میں ایسے حالات میں بھی یہی بہتر ہو گا کہ رقم کو گھر پر رکھنے کی بجائے بینک میں ہی جمع کروایا جائے۔ اس صورت میں بھی وہ بینکاری کاروبار میں رقم لگا رہا ہو گا جو اسلامی نقطہ نظر سے غیر اخلاقی نہیں ہے۔ اخلاقیات کی بنیادی ذمہ داری قرض لینے والے کاروبار پر ہوتی ہے نہ کہ بینک کی جس سے قرض لیا جا رہا ہے۔

6۔الربا کی مثالیں

6.1۔ آیئے اب ذرا احادیث (روایات) سے الربا کے بارے ایک مثال لیتے: ایک دفعہ حضرت بلال برنی قسم کی کھجور حضرت محمد ﷺ کے لئے لے کر آئے۔ آپ حضرت محمد ﷺ نے ان سے پوچھا اے بلال یہ کھجور کہاں سے لے کر آئے ہو۔ حضرت بلال نے جواب دیا "میرے پاس کچھ گھٹیا کوالٹی کی کھجوریں تھیں سو میں نے ان کے دو صاع (پیمائش کا ایک پیمانہ) کے بدلے بڑھیا کوالٹی کی برنی کھجوروں کا ایک صاع بدل لیا ہے تاکہ آپ کے کھانے کے لئے بڑھیا کھجور پیش کر سکوں"۔ اس پر حضرت محمد ﷺ نے فرمایا "خبر دار! خبر دار! یہ تو یقیناً الربا ہے! یہ تو یقیناً الربا ہے "ایسا مت کرو، لیکن اگر تم بڑھیا کھجوریں ہی خریدنا چاہتے ہو تو پہلے گھٹیا کھجوروں کو رقم (پیسوں) کے بدلے بیچو اور پھر اس رقم سے بڑھیا کھجوریں خریدو" (صحیح بخاری، جلد 3، حدیث نمبر 506)۔

6.1.1۔الربا کے بارے میں ایسی شرائط بیان کرنے والی مثالیں احادیث کے اندر شاذ ہی پائی جاتی ہیں۔ پس آئیں الربا کے قرآنی مفہوم کو سمجھنے کے لئے بڑی احتیاط کے ساتھ اس مثال کا تجزیہ کریں۔ حضرت بلال نے اپنے خیال میں دوسرے شخص (جس کے ساتھ کھجوروں کا تبادلہ کیا گیا) کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے دو صاع گھٹیا کوالٹی کی کھجوروں کے بدلے میں ایک صاع بڑھیا کھجوروں کا لیا اور پھر بھی آپ ﷺ فرما رہے ہیں کہ یہ الربا ہے، آخر کیوں؟

6.1.2۔ وجہ حدیث مبارکہ کے آخری فقرہ میں مضمر ہے۔ دونوں قسم کی کھجوروں کی قیمت کی پیمائش زر (Money) کے ذریعے ان کی اپنی اپنی بازاری قدر کے حوالے سے کی جانی چاہیئے۔ ہو سکتا ہے تبادلے کے وقت گھٹیا کھجوروں کی بازاری قیمت بڑھیا کھجوروں کی بازاری قیمت کے نصف سے کم ہو۔ اس صورت میں حضرت بلال کو ان کے جائز حق سے زیادہ کھجوریں مل گئیں۔ یہ زائد کھجوریں اس شخص کا جائز حق تھا جس سے کھجوریں بدلی گئیں، اور جس کو حضرت بلال نے ناجائز طریقے سے ہڑپ کر لیا۔ بصورت دیگر دوسرا آدمی حضرت بلال کے جائز حق کو ناجائز طریقے سے ہڑپ کر رہا ہو گا۔ دونوں صورتوں میں ایک شخص کا جائز حق دوسرا آدمی ناجائز طریقے سے ہڑپ کر رہا ہو گا۔ اس لئے یہ تبادلہ قرآن (الروم:39) کی رو سے الربا کے زمرے میں آئے گا۔ بے شک ایک تیسرا امکان بھی ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ گھٹیا کھجوروں کی بازاری قیمت بالکل ٹھیک ٹھیک بڑھیا کھجوروں کی بازاری قیمت کے نصف کے برابر ہو۔ اس تیسری صورت میں ظاہر ہے کوئی الربا والا معاملہ تو نہ ہو گا، البتہ پیغمبر ﷺ نے اس کو پسند نہیں فرمایا کہ ایسا معاملہ محض قیاس آرائی پر چھوڑ دیا جائے۔ وہ چاہتے تھے کہ سارے مبادلات میں برملا طور پر شفافیت کو ہی سامنے رکھنا چاہیئے۔ اسی لئے انہوں نے فرمایا کہ یہ یقیناً الربا ہے۔

6.1.3۔ یہ حدیث ان مذہبی علماء کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہے جو اصولوں کی اس حد تک پاسداری کرتے ہیں کہ وہ ہر چیز کو سود کا نام دے کر اسے الربا سے منتھی کر دیتے ہیں چاہے اس میں جائز واجبات اور کمائیاں ہی کیوں نہ آتی ہوں اور جن کو اس کے علاوہ اور کسی چیز میں الربا نظر نہیں آتا۔ یہ اس لئے ہوتا ہے کہ ایسے علماء کے ذہن حقیقتاً الربا کے اس قرآنی تصور کو جذب نہیں کر پاتے جن کا اعلان اس سلسلے میں قرآنی آیات کر رہی ہوتی ہیں۔

6.2۔ غلامی صرف نام کی حد تک ختم ہوئی ہے؛ اسی لئے اب بھی ہم اکثر بے گاری(Bonded Labor) کے بارے میں سنتے ہیں۔ یہ خاص کر دیہاتوں میں، غریبوں کے معاشی استحصال کے سوا کچھ نہیں ہے۔ عموماً ایسے ہوتا ہے کہ مثلاً، ایک امیر زمیندار ایک غریب شخص کو اس کی بیٹی کی شادی کے موقع پر موقعہ پر، اس کی ساری جائداد رہن رکھ کر کچھ رقم ادھار دے دیتا ہے۔ وہ غریب شخص رقم واپس نہیں کر سکتا تو اس کی ساری جائداد بحق زمیندار قرق ہو جاتی ہے اور اس کے سارے گھرانے کا انحصار اس زمیندار پر ہو جاتا ہے۔ اب یہ گھرانہ سارا دن انہی کھیتوں میں کام کرتا ہے جو کبھی اس کے اپنے ہوا کرتے تھے لیکن اب زمیندار کی ملکیت میں جا چکے ہیں۔ وہ ان کو صرف اتنا روزینہ (معاوضہ) دیتا ہے جس سے وہ بمشکل دو وقت کی روٹی کھا سکیں اور اپنی زندگی کا سلسلہ جاری رکھ سکیں۔ تھوڑے بہت فرق کے ساتھ اس قسم کی صورت حال(Situation) عموماً انڈین اور پاکستانی فلموں میں بھی دکھائی جاتی ہے۔ یہ ساری کی ساری کہانیاں محض زرخیز قوت متخیلہ کی پیداوار نہیں ہوتیں بلکہ ان کا بڑی حد تک تعلق حقیقی دنیا سے بھی ہوتا ہے۔

6.2.1۔ اوپر پیراگراف میں بیان کردہ کہانی میں الربا کی دو مثالی صورتیں ہیں۔ پہلی صورت میں اگرچہ معاہدہ رہن کے ذریعے سے زمیندار کو غریب گھرانے کی زمین قرق کرنے کا باضابطہ طور پر قانونی تحفظ حاصل ہو جاتا ہے لیکن یہ قرقی غیر منصفانہ اور غاصبانہ ہوتی ہے۔ عموماً ہوتا کیا ہے کہ لاکھوں کی زمین یا جائداد ہزاروں میں رہن رکھ دی جاتی ہے۔ مثلاً وہ زمین جس کی بازاری قیمت ایک لاکھ روپے ہے وہ پانچ ہزار روپے کے بدلے رہن رکھ دی جاتی ہے۔ زمین دار رقم کی واپسی کے لئے غریب گھرانے کو ایک سال کا عرصہ دیتا ہے جس کے دوران حد درجہ زیادہ شرح سے سود لگا کر غریب گھرانے کو اس پر مجبور کر دیا جاتا ہے کہ وہ سال کے آخر پر سود کی اتنی رقم ادا کرے جو اصل زر کے برابر ہوتی ہے۔ وہ غریب گھرانہ جو پہلے ہی زمین کی آمدنی پر بمشکل گزارہ کر رہا ہوتا ہے اس کے لئے یہ مشکل ہو جاتا ہے کے وہ اب اپنی زمین رہن سے آزاد کروانے کے لئے دوگنی رقم ادا کرے۔ اور جب وہ یہ نہیں کر پاتا تو معاہدہ رہن کے مطابق زمین بحق زمیندار قرق ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت حال میں سورہ الروم کی آیت نمبر 39 کے مطابق الربا کے حقیقی لغوی مفہوم کا اطلاق ہو جاتا ہے۔ زمیندار ایک حقیر رقم 5000 روپے کے بدلے میں غریب گھرانے کی ایک لاکھ مالیت کی زمین غیر منصفانہ اور ظالمانہ طریقے سے غصب کر کے اپنی دولت میں اضافہ کر لیتا ہے۔

6.2.2۔ جو کہانی اوپر پیراگراف 6.2 میں بیان کی گئی تھی اس میں الربا کی دوسری مثالی صورت یہ ہے کہ زمیندار غریب گھرانے کے ہر فرد (ان بچے اور بچیوں سمیت بھی جو تھوڑا بہت بھی کام کرسکنے کے قابل ہوں) سے سارا دن کام لیتا ہے۔ لیکن جو معاوضہ ان کو دیا جاتا ہے وہ بمشکل ان کی کھانے اور پہننے کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ پہلے، بچے گاؤں کے سکول میں پڑھنے کے لئے جاتے تھے لیکن اب زمیندار کہتا ہے کہ وہ پورے گھرانے کی کھانے اور پہننے کی ضروریات کا کفیل نہیں ہوسکتا تا آنکہ بچے بھی کھیت میں آکر کام کریں۔ پس اس طرح سے بچوں کو سکول چھوڑنے اور زمیندار کے لئے کھیت میں یا اس کے گھر پر کام کرنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ زمیندار اگر چاہتا تو وہ غریب گھرانے کو اچھی اجرتیں دے سکتا تھا اگر وہ انہیں کھیتی باڑی کرنے کے لئے بہتر طریقے بتاتا اور انہیں بہتر آلات و اوزار فراہم کرتا جن کا وہ متحمل بھی ہوسکتا تھا اور اس طریقے سے وہ اپنی پیداوار بھی بڑھا سکتا تھا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ وہ غریب گھرانے کی قیمت پر اپنے آپ کو امیر سے امیر تر کرتا رہا۔ اس نے غریب گھرانے کے افراد کو ان کی جائز مزدوری (جو اس کے ذمے واجب تھی) ادا نہیں کی بلکہ ان کو گذارہ الاؤنس دیتا رہا جیسے کوئی کسی کو خیرات دیتا ہے۔ یہ بھی محولہ بالا آیت کی روشنی میں بالکل اور واضح طور پر الربا ہے۔

6.2.3۔ کچھ تغیر و تبدل کے ساتھ اوپر پیراگراف 6.2 میں بیان کردہ دیہاتی کہانی کی کئی اور شہری شکلیں بھی دیکھنے میں آتی ہیں۔ شہروں اور قصبات میں ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر غریب لوگ مثلاً گھریلو ملازمین، اور کچھ ایسی فرموں کے ملازمین جن کو انکے کام کا پورا معاوضہ نہیں ملتا اپنے قیمتی اثاثے قرضوں کے بدلے رہن رکھ دیتے ہیں اور پھر قرضہ ادا نہ کرسکنے کی وجہ سے انہیں اپنے ان اثاثوں سے محروم ہونا پڑتا ہے۔ بہر حال یہ شکلیں بھی الربا ہی کی مثالیں ہیں۔

6.3۔ سورہ البقرہ کی آیت نمبر 275 کے مطابق ہم پہلے ہی یہ دیکھ چکے ہیں کہ قرآن ان لوگوں کی مذمت کرتا ہے جو کہتے ہیں کہ بیع (کاروبار یا تجارت) الربا کی مثل ہے۔ قرآن مزید زور دے کر وضاحت کرتا ہے کہ اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور الربا کو حرام۔ ہمارے بہت سے مذہبی قائدین کے نزدیک اس الٰہی بیان کی اہمیت ہی ختم ہو چکی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شائد وہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ تجارت کی کسی بھی سرگرمی میں الربا ہوتا ہی نہیں۔ اس لئے ہم کسی مذہبی قائد کو تاجر اور کاروباری حضرات کے غیر معمولی اور خلاف دستور منافعوں کو الربا کہتے ہوئے نہیں سنتے۔ حالانکہ تاجروں کا ایسے منافعوں کو بٹورنا سورہ الروم کی آیت نمبر 39 کے تحت الربا کے زمرے میں آتا ہے کیونکہ ایسے خلاف دستور غیر معمولی منافعوں کو حاصل کرنا صرف بعض خصوصی حالات میں ہی ممکن ہوسکتا ہے مثلاً جب کوئی تاجر کسی شے کی ذخیرہ اندوزی کرکے بازار میں اپنی اجارہ داری قائم کرلے۔ اور جب اسے اجارہ داری حاصل ہو جاتی ہے تو وہ زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرنے کی غرض سے اس شے کی قیمت میں ممکنہ حد تک اضافہ کر دیتا ہے۔ پس وہ غیر منصفانہ طریقے سے صارفین کی جیبوں سے ان رقوم سے زائد رقوم نکلواتا ہے جو جائز طور پر ان کے ذمے بنتی تھیں۔ اس طرح

سے وہ اپنے جائز واجبات سے زیادہ وصول کر کے الربا میں ملوث ہو جاتا ہے اگرچہ وہ بظاہر تجارت کی ایک مجوزہ سرگرمی کر رہا ہوتا ہے۔ سورہ البقرہ کی آیت نمبر 275 الربا سے پاک تجارت کی اجازت دے رہی ہے یعنی ایسی تجارت جس میں الربا شامل نہ ہو اور یہ کہ الربا جس شعبہ سرگرمی سے بھی حاصل کیا جائے گا وہ حرام ہی ہوگا چاہے وہ تجارت ہو یا کوئی اور شعبہ۔

6.4۔ ہندوستان میں سرکاری ملازمین کی پیشہ ورانہ اخلاقیات سے میرا ذاتی طور پر کافی واسطہ رہا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ دفتر لیٹ آنے کے عادی ہوتے ہیں۔ پھر وہ کافی وقت اپنی ذاتی صفائی ستھرائی اور چائے پینے میں لگا دیتے ہیں اور اس کے بعد چار و ناچار اپنی میز پر آکر لمبے عرصے سے زیر التوا رکھی ہوئی فائلوں پر غور کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ جونہی وہ ایسی درجنوں زیر التوا فائلوں میں سے ایک آدھ کو نپٹاتے ہیں لنچ ٹائم ہو جاتا ہے۔ نصف گھنٹے کا لنچ ٹائم عموماً گھنٹے سے اوپر کا ہوتا ہے۔ اگر کوئی رشتہ دار یا دوست گپ شپ کے لئے نہ آجائے تو فائلوں پر تھوڑا اور کام کر لیا جاتا ہے۔ فائلوں پر مزید ایک گھنٹہ اور صرف کر لینا عموماً کافی تصور کیا جاتا ہے۔ دفتری اوقات کے ختم ہونے تک کا باقی وقت رفقاء کار کے ساتھ گپ لگانے یا فون پر یاروں، دوستوں اور رشتہ داروں کے ساتھ باتیں کرنے میں صرف ہو جاتا ہے۔ اگر ذاتی باتیں ختم ہو جائیں تو گفتگو حالات حاضرہ اور کھیلوں کے میدانوں کی طرف چلی جاتی ہے یا اگر ممکن نظر آئے تو کسی ضروری اور ناگزیر گھریلو کام کا بہانہ بنا کر جلدی دفتر چھوڑنے کے لئے اجازت طلب کر لی جاتی ہے۔

6.4.1۔ میرا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ سارے سرکاری ملازمین ایسا ہی کرتے ہیں جیسا اوپر بیان کیا گیا ہے، لیکن کچھ تو ضرور ایسے ہی ہوتے ہیں۔ یہاں پر یہ ایسے ہی کچھ لوگ ہمارا موضوع ہیں۔ حکومت ان کو ان کے ہر روز کے آٹھ گھنٹے کے کام کی پوری تنخواہ دیتی ہے۔ ہو سکتا ہے کسی بھی انسان کے لئے جسمانی طور پر آٹھ گھنٹے متواتر کام کرنا ممکن نہ ہو، لیکن وہ آٹھ میں سے کم از کم پانچ یا چھ گھنٹے تو دیانت داری، تندہی اور جاں فشانی سے کام کر سکتا ہے۔ لیکن جن افسران کا یہاں ذکر ہو رہا ہے وہ تو دل جمعی کے ساتھ دو یا تین گھنٹوں سے زیادہ کام کرنا گوارا ہی نہیں کرتے۔ سورہ الروم کی آیت نمبر 39 کی رو سے یہ صاف طور پر الربا ہے۔ جو کام یہ لوگ چھوڑ دیتے ہیں وہ بہر حال دفتر کے دوسرے ساتھیوں کو ہی نپٹانا پڑتا ہے۔ اس صورت حال میں بد دیانت ملازمین ظالمانہ طریقہ سے دیانت دار ملازمین کی جائز آمدنیوں کو ہڑپ کر رہے ہوتے ہیں، اور یوں وہ الربا کے جرم کا ارتکاب کر رہے ہوتے ہیں۔

6.5۔ اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ تقریباً زندگی کے ہر میدان میں، پردے کے پیچھے الربا ہی گھات لگائے بیٹھا ہوتا ہے۔ جو شخص لالچ، حرص اور طمع کی سفلی اور ارذل جبلتوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا ہے وہ آسانی کے ساتھ اس (الربا) کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ فوری مادی خوشحالی کی طرف انسان کو اکساتا ہے لیکن جب انسان اس کے پھندے میں پھنس جاتا ہے تو اس کی رسی ڈھیلی کر دی جاتی ہے جو آخر کار ایک نہ ایک دن اپنے برے انجام یعنی عذاب میں پھنس کر ہی رہتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ متنبہ کرتا ہے کہ "

فَاِن لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا فَاۡذَنُوۡا بِحَرۡبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖ" (البقرہ:279) پھر اگر تم نے ایسا نہ کیا (یعنی الربا لینے سے باز نہ آئے) تو تیار ہو جاؤ لڑنے کے لئے اللہ اور اس کے رسول سے۔ حقیقتاً یہ بہت ہی بڑی بھیانک تنبیہ ہے ان کے لئے جو ایمان والے ہیں!

7۔الربا سے متعلق احادیث۔I

7.1۔ایک حدیث کا حوالہ پہلے ہی پیرا گراف 6.1 میں دیا جاچکا ہے، جس کے تجزیے نے یہ ثابت کیا تھا کہ وہ حدیث مبارکہ واقعی الربا کے قرآنی تصور کے ساتھ مطابقت رکھتی ہے۔لیکن ایک ناقد نے اس کتاب کی سابقہ اشاعتوں پر یہ اعتراض کیا تھا "کہ زیادہ زور قرآن پر دینا اور حدیث کا کبھی کبھار یونہی سرسری طور پر ذکر کر دینا----ناانصافی ہے۔"

7.2۔ لیکن الربا کے بارے میں احادیث کا گہری نظر سے مطالعہ کرنے سے پہلے میں اپنے قارئین کو دعوت دوں گا کہ وہ ایک بہت بڑے مسلمان عالم حضرت علامہ اقبال احمد سہیل مرحوم کی کتاب "ربا کیا ہے:What is Riba" میں بیان کردہ "احادیث کو پرکھنے کے کچھ اصول:Some Principles on the Reliability of *Ahaadeeth*" پر ذرا نظر دوڑائیں۔ان اصولوں کا نچوڑ میں نے اس کتاب کے ضمیمہ د میں دے دیا ہے۔میں علامہ صاحب کے ان اصولوں سے اتفاق کرتا ہو۔علامہ صاحب نے اگرچہ ان اصولوں کو بہترین انداز میں بیان کیا ہے لیکن یہ میری محتاط خواہش کا نتیجہ ہے کہ میں نے انہیں اپنے الفاظ میں بیان کرنا مناسب سمجھا۔البتہ یہ ایک دوسرا معاملہ ہے کہ میں ان کی الربا کی تعریف سے متفق نہیں ہوں۔اس لئے میں نے علامہ مرحوم کی کتاب پر اپنا جائزہ ضمیمہ ب میں پیش کر دیا ہے۔

7.3۔اس سلسلے میں میں اپنے قارئین کی توجہ ایک حدیث کی طرف دلوانا چاہوں گا جو نیچے نقل کی جاتی ہے۔حضرت ابن عمر روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر نے ممبر رسول ﷺ اللہ سے ایک خطبے کے دوران ارشاد فرمایا "الکحل کے مشروبات کے پینے کو حکم الٰہی سے منع فرمایا گیا، اور یہ مشروبات انگوروں، کھجوروں، گندم، جو اور شہد سے تیار کئے جاتے تھے۔الکحل مشروب وہ ہے جو ذہن کو مختل کر دے" حضرت عمر نے مزید کہا کہ "میری یہ خواہش تھی کہ کاش! اللہ کے رسول ﷺ تین معاملات کے بارے میں قطعی فیصلہ فرمادینے سے پہلے ہمیں چھوڑ کر نہ جاتے یعنی دادا کو وراثت کیسے ملے گی، کلالہ کی بارہ میں تفصیل اور ربا کی دوسری بہت سی اقسام۔"

7.4۔ آیئے اب ہم اپنے آپ کو الربا کے علاوہ دوسرے معاملات میں الجھائے بغیر صرف اور صرف حدیث کے اس حصہ پر اپنی توجہ مرکوز کریں جو الربا سے متعلق ہے۔باقی معاملات کو ایک طرف رکھتے ہوئے حدیث کے مطابق حضرت عمر فرماتے ہیں کہ " میری یہ خواہش تھی کہ کاش! اللہ کے رسول نے ہمیں چھوڑنے سے پہلے الربا کی اقسام کے بارے میں حتمی حکم دیا ہوتا۔"

7.5۔ اب اس حدیث کا کیا مطلب نکلتا ہے ؟ کیا اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ جب اللہ کے رسول نے اس دنیا سے رحلت فرمائی، الربا کے بارے میں اللہ کا قانون (نعوذ باللہ) نامکمل تھا؟ نہیں! ہرگز ایسا نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں، "۔۔۔اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔۔۔" (المائدہ:3)۔ آج مکمل کر دیا ہے میں نے تمہارے لئے تمہارا دین اور پوری کر دی تم پر اپنی نعمت اور پسند کر لیا ہے تمہارے لئے اسلام کو دین کے طور پر۔ لہٰذا حضور کے اس دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے اللہ کا قانون مکمل ہو چکا تھا۔ پس ہم یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ جس وقت آپ نے اس دنیا سے رحلت فرمائی اللہ کا دین (قانون) نامکمل تھا۔

7.6۔ پس دیکھیئے جس شخص کا پس منظر قرآنی علم کے بارے میں نہیں ہو گا وہ کیسے بڑی آسانی کے ساتھ حدیث پڑھنے سے دھوکہ کھا سکتا ہے۔ اس لئے احادیث کو قرآن کی روشنی میں ہی دیکھا جانا چاہیئے۔

7.7۔ بدقسمتی سے ہمارے علماء الربا کی ممانعت کے معانی کو صحیح طور حل کرنے کے لئے اس درخشان قرآنی روشنی کو استعمال ہی نہیں کرتے۔ ان کا خیال ہے کہ اس قرآنی اصطلاح کی تعریف اور وضاحت قرآن پاک میں دی ہی نہیں گئی۔ اس قسم کی سوچ گستاخانہ سوچ ہے کیونکہ یہ بار بار دہرائی جانے والی ان آیات کے خلاف جاتی ہے جو قرآن کے بارے میں اعلان کر رہی ہیں کہ یہ کتاب سارے انسانوں کے لئے ایک الٰہی قانون اور جو کچھ اس کے اندر ہے وہ کھول کھول پوری وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔ مثلاً "۔۔۔ کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمْ اٰیٰتِہٖ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ" (المائدہ:89)۔ اسی طرح بیان کرتا ہے اللہ تمہارے لئے اپنے احکام تاکہ تم شکر گذار بنو۔ "۔۔۔ اُنْظُرْ کَیْفَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ ثُمَّ ھُمْ یَصْدِفُوْنَ" (الانعام:46)۔ دیکھ کس طرح ہم بار بار پیش کرتے ہیں نشانیاں پھر بھی یہ لوگ روگردانی کرتے ہیں۔ "۔۔۔ وَ کَذٰلِکَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ وَلِتَسْتَبِیْنَ سَبِیْلُ الْمُجْرِمِیْنَ" (الانعام:55)۔ اور اسی طرح تفصیل سے بیان کرتے ہیں ہم اپنی نشانیاں اس لئے کہ پوری طرح نمایا ہو جائے راستہ مجرموں کا۔ مزید حوالوں کے لئے ان آیات کا مطالعہ کریں۔ اٰل عمران:7، الانعام:65، 98، 105 اور 126۔

7.8۔ اب دوبارہ اس حدیث کی طرف لوٹ آیئے جو پیراگراف نمبر 7.3 میں بیان کی گئی ہے۔ پھر حضرت عمر جیسی عظیم اور اعلیٰ مرتبت شخصیت نے الربا کے بارے میں وہ کیوں کہا جو ان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے ؟ وہ حضور ﷺ کے بہت ہی نمایاں اور ممتاز صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے ایک تھے۔ وہ مسلم دنیا کے دوسرے خلیفہ تھے۔ ان کی خلافت کے دوران مسلمان آسمان کی بلندیوں کو چھو رہے تھے اور اس وقت کی دنیا پر ان کی سیاسی، عسکری اور اخلاقی قوت کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ اور تاریخ

شاہد ہے کہ وہ زمین پر حکمرانی کرنے والے حکمرانوں میں انصاف، خدا ترسی اور انتظامی کامیابیوں کے حوالے سے سب سے اونچے مقام پر فائز تھے۔

7.9۔ پھر اسلامی دنیا کی ایک ایسی نمایاں اور ممتاز ہستی ایسا بیان کیونکر دے سکتی ہے جو سراسر یہ غلط تاثر پیدا کرے کہ الربا کے بارے میں اسلامی قانون نامکمل ہے؟

7.10۔ اگر ہم نے اتنے انتہائی اہم سوال پر ذرا بھی سنجیدگی سے غور کیا ہوتا تو امت مسلمہ کا رویہ آج اس محاوراتی اندھے آدمی کی طرح کا نہ ہوتا جو باقی اندھوں سے پوچھ پوچھ کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ہاتھی کیسا ہوتا ہے۔ ہم الربا کے معاملے میں اندھے ہی رہے کیونکہ اپنی ہٹ اور ضد پر قائم پر رہتے ہوئے اس معاملے میں ہم قرآنی کرنوں سے روشنی لینے سے انکار ہی کرتے رہے۔ یہ ایک حقیقت ہے اگرچہ کھلے دماغ ہم میں سے کوئی بھی اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ ہوگا کہ ہم اب تک ان اندھے آدمیوں کی طرح جزوی سچائیوں کی تلاش میں لگے ہوئے ہیں اور ہم نے یہ فرض کر لیا کہ بہت ساری احادیث سے خوشہ چینی کر کے شاید الربا کے حقیقی معنوں تک رسائی حاصل کی جا سکے۔

7.11۔ اوپر ہم دیکھ آئے ہیں کہ جو غلط تاثر حدیث سے پیدا ہو سکتا تھا وہ قرآنی آیت (المائدہ:3) سے دور ہو گیا۔ آیئے اسی روشنی میں ہم دوبارہ اس بیان کو دیکھتے ہیں جو حضرت عمر کی طرف منسوب کیا گیا تھا۔

7.12۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہر وقت ہمیں حقائق کا سامنا کرنے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ حقیقت تو یہی ہے کہ احادیث کو تحریری طور پر حضرت محمد ﷺ کے وصال کے سات آٹھ نسلوں بعد ورطہ تحریر میں لایا گیا۔ اللہ تعالیٰ ان محدثین کو کروڑوں رحمتوں اور انعامات سے نوازے اور ان کے درجات بلند کرے جنہوں نے کامل احتیاط اور ان تھک محنت سے احادیث کی بڑی بڑی ضخیم اور مستند کتب امت کو دینے کے لئے اپنی پوری پوری زندگیاں اس مقصد میں کھپا دیں۔ لیکن ان کے اس شک وشبہ سے بالا اور اخلاص سے بھرپور کام کے باوجود ہم یہ کبھی بھی صدفی صد یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ حضرت عمر کا بیان جس کا اوپر ذکر ہو چکا بالکل انہی الفاظ میں ہم تک منتقل ہوا ہے جو زیر نظر حدیث میں ان کی طرف منسوب کئے گئے ہیں۔ ہم اپنے تجربے کی بنا پر یہ بات بخوبی جانتے ہیں کہ ایک بیان جو ایک شخص دیتا ہے وہ ایک گھنٹے کے اندر اندر بلا ارادہ کیسے بدل جاتا ہے جب وہ زبانی طور پر ایک کے بعد دوسرے تک پانچ یا چھ افراد کے واسطے سے پہنچتا ہے۔

7.13۔ یہی وجہ ہے کہ مستند احادیث کو بھی متعلقہ قرآنی آیات کو سامنے رکھ کر پرکھنے کی ضرورت پیش آتی ہے کیونکہ موخر الذکر کو ان کے نازل ہونے کے فوراً ابعد ہی لکھ لیا گیا تھا اور ان کی کوئی اور نہیں بلکہ خود پیغمبر حضرت محمد ﷺ کی ذات مبارکہ ہی بار بار توثیق و تصدیق کرتی رہتی تھی۔

7.14۔ یہ بات آفاقی طور پر تسلیم شدہ ہے کہ اسلامی قانون کے مواخذ دو ہی ہیں۔(الف) قرآن اور (ب) سنت۔ سورہ المائدہ کی آیت نمبر 3 کی روشنی میں حضرت عمر کا بیان یوں ہونا چاہیئے کہ سنت میں الربا کے بارے میں پوری وضاحت موجود نہیں ہے۔ اور چونکہ سنت سے ایسی وضاحت نہیں مل رہی اس لئے یہ قرآن میں موجود ہونی چاہیئے۔

7.15۔ پس ہم آخر میں یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ یہ قرآن ہی ہے جو الربا کی تعریف اور اس کی مکمل وضاحت کرتا ہے۔ الربا کے بارے میں تمام حدیثوں کو قرآن کی اس تعریف اور وضاحت کی روشنی میں ہی سمجھنا ہوگا ورنہ تو امت مسلمہ کے بھٹکنے کی ذمہ داری خود اسی پر ہوگی۔ اس باب میں محولہ بالا حدیث کے یہی عقلی مضمرات ہیں۔

8۔الربا سے متعلق احادیث۔II

8.1۔ پچھلے باب میں ہم نے دیکھا ہے کہ احادیث کی حیثیت اتنی مسلمہ نہیں ہے جتنی آیات قرآنی کی ہے۔لیکن اس حقیقت سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کر لینا چاہیئے کہ ہمیں احادیث کی ضرورت ہی نہیں ہے اور ہم ان کے بغیر ہی گذارہ کر لیں گے۔ نہیں ہمارا ان کے بغیر گزارہ نہیں ہو سکتا ۔ احادیث کی وساطت سے ہی ہمیں سنت کا پتہ چلتا ہے۔ سنت ہمارے پیغمبر حضرت محمد ﷺ کا ایک مقررہ عمل تھا اور اس سنت کے بغیر اسلام کے کچھ پہلو نا مکمل رہ جاتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "ـــــ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ـــــ" (النسآء: 59)۔ پھر اگر جھگڑا ہو جائے تمہارے درمیان کسی معاملہ میں تو پھیر دو اسے اللہ کی طرف اور رسول کی طرف اگر تم واقعی اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔

8.2۔ تب ہمارے ذہنوں میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ پھر اللہ تعالیٰ نے سنت کو اتنا مسلمہ اور محفوظ کیوں نہیں بنایا جتنا کہ قرآن پاک کو بنایا ہے۔ وہ جو بھی کرتا ہے کسی نہ کسی منصوبے کے تحت ہی کرتا ہے ۔ پس اس کا بھی کوئی نہ کوئی تو الٰہی مقصد ہو گا۔شاید اس کا مقصد یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ ہمارا امتحان لینا چاہتے ہوں کہ ہم ہر شک وشبہ سے بالا ہو کر کتنی ثابت قدمی کے ساتھ قرآن کی کامل مسلمہ حیثیت سے اپنی وابستگی قائم رکھتے ہیں۔وہ ہمارا امتحان لینا چاہتے ہوں کہ آیا کہیں ہم اندھوں کی طرح احادیث کا جائزہ قرآن کی روشنی کے بغیر تو نہیں لے رہے۔

8.3۔ پس آئیے الربا کے بارے میں دوسری احادیث کا جائزہ بھی پہلے باب میں دی گئیں قرآنی آیات کی روشنی میں لیتے ہیں۔

8.4۔ جس حدیث کا حوالہ باب 6 کے پیرا گراف 6.1 میں دیا گیا تھا اس کے کئی متغیرات (Variants) الفاظ کے معمولی تغیر کے ساتھ مختلف مقامات پر آئے ہیں۔ ان متغیرات کو احادیث کی متعلقہ کتابوں میں سے نیچے نقل کیا جارہا ہے۔

(1) صحیح بخاری، جلد سوم، باب 34،حدیث نمبر 294: ابو سعید روایت کرتے ہیں : "ہمیں ملی جلی(Mixed) کھجوریں دی جاتی تھیں اور ہم (ان کے) دو صاع کو (بڑھیا کھجوروں کے) ایک صاع کے بدلے بیچا کرتے تھے۔پس پیغمبر ﷺ نے فرمایا" دو صاع،ایک صاع کے بدلے نہ بیچو اور نہ ہی دو درہم ایک درہم کے بدلے جائز ہے۔"

(2) صحیح بخاری، جلد سوم، باب 34،حدیث نمبر 405: ابو سعید خدری اور حضرت ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں : اللہ کے رسول ﷺ نے کسی کو خیبر کا گورنر مقرر فرمایا۔ وہ گورنر آپ کی خدمت میں بہترین قسم کی کھجوریں لے کر حاضر ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا" کیا خیبر کی ساری کھجوریں ایسی ہی ہوتی ہیں؟"اس نے جواب دیا"اللہ کی قسم ،نہیں اے اللہ کے رسول !ہم نے ان (بڑھیا کھجوروں)کا ایک صاع اپنی کھجوروں کے دو صاع کے بدلے اور ان کے دو صاع اپنی کھجوروں کے تین صاع کے بدلے میں لئے ہیں۔"اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا " ایسا مت کرو ، بلکہ اپنی ملی جلی (Mixed)گھٹیا قسم کی کھجوروں کو زریا رقم(Money)یعنی پیسوں کے بدلے بیچو اور پھر بڑھیا قسم کی کھجوروں کو اسی رقم کے عوض خریدو۔"

(3) صحیح بخاری، جلد سوم، باب 38،حدیث نمبر 499: ابو سعید خدری اور حضرت ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں اللہ کے رسول ﷺ نے ایک شخص کو خیبر کا گورنر مقرر کیا۔ جب وہ (گورنر) مدینہ آیا وہ اپنے ساتھ 'جنیب' قسم کی کھجوریں لے کر آیا۔ رسول ﷺ نے ان سے پوچھا " کیا خیبر کی ساری کھجوریں اسی قسم کی ہوتی ہیں؟"اس شخص(گورنر)نے جواب دیا، "ہم نے دو صاع گھٹیا کھجوروں کے بدلے میں ایک صاع اس قسم یعنی "جنیب" کھجوروں کالیا ہے۔ یا تین صاع کے بدلے میں دو صاع۔" یہ سن کر رسول ﷺ نے فرمایا " ایسا مت کیا کرو ، کیونکہ ایسا کرنا ربا کی ایک قسم ہے، بلکہ ایسا کیا کرو کہ اپنی گھٹیا کولٹی کی کھجوروں کو زریعنی روپوں پیسوں کے بدلے بیچا کرو اور پھر" جنیب" کھجوروں کو اس رقم سے خرید لیا کرو"رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس کا بھی وہی حکم ہے جو تم تول کر بیچو۔

(4) صحیح مسلم، باب 010،حدیث نمبر 3869: احضرت ابو ہریرہ اور ابو سعید خدری روایت کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے بنو عدی الانصاری کے ایک شخص کو خیبر سے محصولات اکٹھا کرنے کے لئے مقرر فرمایا۔ وہ بہت ہی بڑھیا کھجوروں کے ساتھ واپس آیا جس پر اللہ کے رسول ﷺ نے اس سے کہا کیا خیبر کی ساری کھجوریں ایسی ہی ہوتی ہیں؟اس نے کہا اے اللہ کے رسول ﷺ ایسا نہیں ہے۔ ہم نے (بڑھیا کھجوروں کا)ایک صاع ، کھجوروں کی کل مقدار (جس میں گھٹیا کوالٹی کی کھجوریں بھی شامل تھیں) کے دو صاع کے بدلے میں خریدا ہے، جس پر اللہ کے رسول ﷺ

نے فرمایا ایسا مت کرو بلکہ مثل کے بدلے مثل لو یا (پھر ان گھٹیا قسم کی کھجوروں کو قیمت کے عوض) بیچو اور پھر ان کو بڑھیا کھجوروں کو اس قیمت کے عوض خریدو اور ماپ بھی پورا رکھو۔

(5) صحیح مسلم، باب 010، حدیث نمبر 3870: حضرت ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ایک شخص کو خیبر سے محصولات اکٹھا کرنے کے لئے مقرر فرمایا۔ وہ بڑھیا کھجوریں لے کر آیا جس پر اللہ کے رسول ﷺ نے پوچھا کیا خیبر کی ساری کھجوریں ایسی ہوتی ہیں؟ اس نے جواب دیا کہ نہیں ۔ ہم نے (بڑھیا کھجوروں کا) ایک صاع (گھٹیا کھجوروں کے) دو صاع اور دو صاع کو تین صاع سے بدلا ہے ۔ اس پر اللہ کے رسول ﷺ نے کہا: ایسا مت کیا کرو بلکہ پہلے گھٹیا کھجوروں کو درہموں(Money) کے بدلے بیچا کرو اور پھر ان درہموں سے بڑھیا کوالٹی کی کھجوریں خریدا کرو۔

(6) صحیح مسلم، باب 010، حدیث نمبر 3871: عبد سعد روایت کرتے ہیں کہ حضرت بلال (برنی) بڑھیا قسم کی کھجوریں لے کر آئے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے دریافت فرمایا یہ کھجوریں کہاں سے لے کر آئے ہو؟ حضرت بلال نے عرض کیا کہ ہمارے پاس گھٹیا قسم کی کھجوریں تھیں میں نے ان (گھٹیا کھجوروں) کے دو صاع کو اللہ کے رسول ﷺ کے کھانے کے لئے (بڑھیا قسم کی کھجوروں) کے ایک صاع سے بدل لیا ہے، جس پر اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا افسوس! در حقیقت یہ ربا ہے۔ اس لئے ایسا مت کیا کرو۔ لیکن جب تمہیں بڑھیا قسم کی کھجوریں خریدنا ہوں تو پہلے اپنی گھٹیا کھجوروں کو علیحدہ سے سودا کر کے بیچا کرو اور پھر بڑھیا کھجوریں خریدا کرو۔ اور جو حدیث اس بارہ میں حضرے سہل سے مروی ہے اس میں "جس پر" کے لفظ کا ذکر نہیں ہے۔

(7) صحیح مسلم، باب 010، حدیث نمبر 3872: ابوسعد روایت کرتے ہیں کہ کھجوریں اللہ کے رسول ﷺ کے پاس لائی گئیں اور انہوں نے کہا کہ یہ کھجوریں ہماری کھجوروں جیسی نہیں ہیں جس پر ایک شخص نے کہا: ہم نے اپنی کھجوروں کے دو صاع ان (بڑھیا کھجوروں) کا ایک صاع حاصل کرنے کے لئے دیئے ہیں جس پر اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا یہ تو ربا ہے، سو انہیں(بڑھیا کھجوروں کو) واپس کر دو اور اپنی (گھٹیا کوالٹی کی کھجوریں) واپس لو؛ پھر اپنی کھجوروں کو (زر یعنی پیسے لے کر) بیچو اور پھر (ان پیسوں کے ساتھ) ایسی (بڑھیا کھجوریں) خریدو۔

(8) صحیح مسلم، باب 010، حدیث نمبر 3873: ابوسعد روایت کرتے ہیں کہ جب حضور ﷺ حیات تھے ہمیں کچھ اقسام کی ملی جلی کھجوریں کھانے کے لئے دی گئیں۔ ہم ایسی کھجوروں کے دو صاع بڑھیا کوالٹی کی کھجوروں کا ایک صاع لے کر فروخت کر دیا کرتے تھے۔ یہ بات اللہ کے رسول ﷺ تک پہنچی جس پر انہوں نے کہا: کہ (گھٹیا قسم کی

کھجوروں) کے دو صاع کو (بڑھیا کھجوروں کے) ایک صاع سے اور (گھٹیاقسم کی گندم) کے دو صاع کو (بڑھیا گندم) کے ایک صاع سے اور ایک درہم کو دو درہم سے نہ بدلو۔

(9) صحیح مسلم، باب 010، حدیث نمبر 3874: ابو نضرہ روایت کرتے ہیں: میں نے ابن عباس سے (سونے اور چاندی کے بدلے میں چاندی اور سونے) کے تبادلے کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے پوچھا کیا دست بدست تبادلہ ہے ؟ میں نے جواب دیا کہ ہاں جس پر انہوں نے کہا کہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ میں نے ابو سعید کو اس کے بارے میں بتلایا کہ میں نے حضرت ابن عباس سے اس کے بارے میں دریافت کیا تھا تو انہیں نے پوچھا تھا کہ کیا تبادلہ دست بدست ہے؟ میں نے کہا تھا کہ ہاں جس پر انہوں نے کہا کہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ابو سعید نے کہا کیاابن عباس نے نے ایسا کہا: ہم ان کو لکھیں گے اور وہ تمہیں لکھ کر نہیں دیں گے۔ اس نے کہا اللہ کی قسم اللہ کے رسول ﷺ کے خادموں میں سے ایک خادم کھجوریں لے کر حاضر خدمت ہوا، لیکن انہوں نے ان کو قبول کرنے سے اس بنا پر انکار کردیا کہ وہ کھجوریں ہماری زمین کی نہیں لگتی تھیں ۔ انہوں نے کہا ہماری زمین کی کھجوروں کو یا ہماری کھجوروں کو کچھ ہوگیا ہے۔ انہوں نے کہا اس سال ہمارے ملک کی کھجوروں میں کچھ نقصان تھا تو میں نے یہ کھجور لی اور اس کے بدلے میں زیادہ کھجوریں دیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا تونے زیادہ دیا تو ربا دیا۔ اب اس کے پاس نہ جانا جب تم کو اپنی کھجور میں کچھ نقصان معلوم ہو تو اس کو بیچ ڈالو پھر جو کھجور پسند ہو اسے خریدلو۔

8.5۔ جس حدیث کا حوالہ سابقہ پیراگراف میں سیریل نمبر (6) پر دیا گیا ہے وہ تو بالکل وہی ہے جس کا ہم نے اوپر پیرا گراف 6.1 میں ذکر کیا تھا۔ ہم باب 6 میں پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ یہ حدیث باب 1 میں دیئے ہوئے الربا کے قرآنی تصور سے مطابقت رکھتی ہے۔

8.6۔ کچھ احادیث کے طالب علم ، تاہم یہ الزام لگاتے ہیں کہ اس حدیث میں خاص طور پر " یہ الربا ہے" کا جملہ، ہوسکتا ہے کہ ایک اضافہ ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ اس حدیث کے بعد والے راویوں نے غیر اردی طور پر اسے شامل کردیا ہو اور خود ہی پہلے راویوں کے بیان سے یہ نتیجہ اخذ کرلیا ہو کہ شاید رسول ﷺ نے ایسا ہی کہا ہو۔ اس کی حمایت میں وہ پیرا گراف 8.4 پر سیریل نمبر (1) پر دی گئی حدیث کا حوالہ بھی دیتے ہیں جس میں الربا کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

8.7۔ جو احادیث پیراگراف 6.1 اور 8.4 میں مذکور ہیں ان کے بارے میں احادیث کے یہ طالب علم یہ الزام بھی لگاتے ہیں کہ ان کھجوروں والی احادیث کے واقعات اس وقت سے متعلق ہیں جب الربا کی ممانعت کے بارے میں

قرآنی آیات کا نزول ابھی ہوا ہی نہیں تھا۔ اس لئے اس وقت اللہ تعالیٰ کے الربا کے اعلان امتناع سے قبل رسول ایسے مبادلات کو قطعی طور پر بطور الربا کے کیسے منع کر سکتے تھے؟

8.8۔ سابقہ پیرا گراف میں دی گئی دلیل کو کچھ سہارا بلا واسطہ طور اس حدیث سے بھی ملتا ہے جس کا پیرا گراف 7.3 میں اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ یعنی اگر اتنی زیادہ احادیث پہلے سے ہی موجود تھیں جن میں رسول اللہ ﷺ نے بڑے واضح طور پر الربا کے بارے میں احکامات دیئے ہوئے تھے تو پھر حضرت عمر اس تشویش اور برہمی کا اظہار ہرگز نہ فرماتے جو انہوں نے اس حدیث میں فرمایا۔

8.9۔ اور چونکہ احادیث کے ایسے طالب علم، بدقسمتی سے قرآنی روشنی سے رہنمائی حاصل نہیں کرتے، اس لئے انہوں نے سوچا کہ ان میں سے کوئی حدیث بھی کھجوروں کے حوالے سے الربا سے تعلق نہیں رکھتی۔ان کا خیال ہے کہ رسول اللہ ﷺ صرف ان نا انصافیوں کا تدارک چاہتے تھے جو اس قسم کی بڑھیا اور گھٹیا کھجوروں کے مبادلات میں ہوتی تھیں۔ وہ ان احادیث میں مضمر الربا کے کتنے قریب پہنچ کر بھی دور ہی رہے۔ اگر وہ قرآنی روشنی کا استعمال کرتے تو وہ ضرور مشاہدہ کر لیتے کہ الربا ان بے انصافیوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے جن کا امکان تمام انسانی لین دین کے معاملات میں پایا جاتا ہے۔

8.10۔ حدیث کے دوسرے طلباء نے کھجوروں کے حوالے سے ان احادیث سے کچھ اور نتائج اخذ کئے اور بڑے ہی حیران کن فیصلے صادر فرمادیئے کہ الربا کا اطلاق صرف چند ایک اشیاء تک ہی محدود ہے اور کھجور ان میں سے ایک شے ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے خاص طور پر الربا کو اسی کے حوالے سے بیان کیا ہے۔

8.11۔ کھجوروں کے بارے میں احادیث سے یہ بڑا ہی واضح ہے کہ اللہ کے رسول نے ایک ہی جنس کی دو غیر مساوی مقداروں کے تبادلے کی اجازت اس لئے نہیں دی کیونکہ نا انصافی ایسے مبادلات کا جزو لا ینفک ہوا کرتی ہے۔اس لئے انہوں لوگوں کے لئے کھجوروں کے حوالے سے باقی اشیاء کے بارے میں بھی ایک عام اصول بیان فرمادیا کہ اشیاء کا باہمی تبادلہ 'مثل بہ مثل اور دست بدست' ہونا چاہیئے۔ پس اگر دو اشخاص ایک ہی شے کا تبادلہ کرنا چاہتے ہیں، جیسے کھجورروں کا تو یہ تبادلہ موقع پر ہی برابر مقداروں میں ہونا چاہیئے۔

8.12۔ اب یہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی کہ کیا کوئی بھی دو سمجھدار آدمی اس قسم کا مبادلہ کرنے کی کوشش کریں گے جب کہ دونوں کے پاس ایک ہی قسم کی کھجوریں موجود ہوں۔ اس صورت میں تو تبادلہ ہی بے معنی ہو گا ۔ پس یہ کہنے کا مقصد صرف اور صرف ہمیں ایک اصول دینا تھا کہ اشیاء کی مختلف اقسام کے درمیان اس قسم کے مبادلات نہ کئے جائیں جن میں ناانصافی اور الربا کے پائے جانے کا احتمال پایا جاتا ہو۔

8.13۔ لیکن اس پیغمبرانہ اصول سے کچھ طالبان حدیث نے ایک اور عام اصول اخذ کرلیا کہ اگر ایک شے مثلاً کھجور کا تبادلہ ایک دوسری شے مثلاً گندم سے کیا جائے تو اس میں الربا شامل نہیں ہوتا، چاہے مبادلے کی کوئی بھی نسبت ہو۔ اس قسم کے اصول الربا کے قرآنی تصور کو واضح طور پر نہ سمجھنے کی وجہ سے بنائے گئے۔ اگر اس اصول کے بنانے والے اس قرآنی تصور سے ذرا بھی واقف ہوتے کہ در اصل کسی بھی مبادلے میں ناانصافی ہی الربا ہے تو وہ دوسری اشیاء کے درمیان مبادلے میں بھی الربا کو محسوس کر سکتے تھے۔

8.14۔ رسول اللہ ﷺ نے الٰہی ہدایت کی روشنی میں ان خاص معاملات میں اپنا فیصلہ سنایا، اور جس کا انہیں استحقاق بھی حاصل تھا،جو ان کے پاس لائے گئے یا جو ان کے نوٹس میں آئے۔ ہمارے لئے اب یہ غلط ہو گا کہ بغیر الٰہی ہدایت کے جو اب ہمارے پاس قرآن میں پائی جاتی ہے ان فیصلوں کی تعمیم (Generalize) کر دی جائے۔

8.15۔ اس الٰہی ہدایت کی روشنی میں ہم دیکھ سکتے ہیں جیسا کہ ہم نے باب 6 میں مشاہدہ کیا تھا، کہ پیرا گراف 8.4 میں دی گئی احادیث میں مختلف اقسام کی کھجوروں کا تبادلہ کو الربا کہا گیا۔ اسی لئے حضرت محمد ﷺ نے ایسے مبادلات کو منع فرمایا۔

9۔الربا سے متعلق احادیث۔III

9.1۔ پچھلے باب میں 'مثل بہ مثل اور دست بدست ' کے پیغمبرانہ اصول کا ذکر کیا گیا تھا۔آیئے اب اس بارہ میں مزید احادیث پر غور کریں۔

9.2۔ایسی کچھ احادیث نیچے بیان کی جارہی ہیں:

(1) صحیح بخاری، جلد 3، باب 34،حدیث نمبر 379:ابن عمرروایت کرتے ہیں :نبی کریم ﷺ نے فرمایا 'گیہوں کو گیہوں کے بدلہ میں بیچنا الربا ہے' لیکن یہ کہ سودا دست بدست ہو۔جو کو جو کے بدلہ میں بیچنا الربا ہے لیکن یہ کہ سودا دست بدست ہواور کھجور کو کھجور کے بدلہ میں بیچنا الربا ہے لیکن یہ کہ سودا دست بدست اور نقدا نقد ہو۔

(2) صحیح بخاری، جلد 3، باب 34،حدیث نمبر 382: ابن شہاب روایت کرتے ہیں کہ مالک ابن اوس نے کہا کہ انہیں سو اشرفیاں بدلنی تھیں ۔طلحہ بن عبیداللہ نے بلایا۔ اور ہم نے بات چیت کی ، اور ان سے میرا معاملہ طے ہوگیا وہ سونے(اشرفیوں) کو اپنے ہاتھ میں لے کر الٹنے پلٹنے لگے اور کہنے لگے کہ ذرا میرے خزانچی کو غابہ سے آلینے دو ۔ عمر بھی ہماری باتیں سن رہے تھے، آپ نے فرمایا خدا کی قسم ! جب تک تم طلحہ سے روپیہ نہ لے لو ، ان سے جدا نہ ہونا ۔کیونکہ رسول اللہ ﷺ نہ فرمایا کہ سونا سونے کے بدلہ میں اگر دست بدست اور برابر برابر نہ ہو تو الربا ہوجاتا ہے۔ جو جو کے بدلہ میں اگر دست بدست اور برابر برابر نہ ہوتو الربا ہوجاتا ہے اور کھجور کھجور کے بدلہ میں دست بدست اور برابر برابر نہ ہوتو الربا ہوجاتی ہے۔

(3) صحیح مسلم ، کتاب 010، حدیث نمبر 3845:ابو سعید خدری روایت کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ کو انہوں نے کہتے ہوئے سنا : سونے کو سونے سے نہ بیچو لیکن مثل بہ مثل اور اس کے کچھ پر کچھ کا اضافہ نہ کرو؛اور چاندی کو چاندی سے نہ بیچو مگر مثل بہ مثل اور اس کے کچھ پر کچھ کا اضافہ نہ کرو، اور نقد رقم کو ادھار کے بدلے مت بیچو۔

(4) صحیح مسلم ، کتاب 010، حدیث نمبر 3846:نافع روایت کرتے ہیں کہ لیث قبیلے کے ایک شخص نے عبداللہ بن عمر سے کہا کہ ابوسعید خذری اس کو نقل کرتے ہیں حضرت محمد ﷺ سے۔ قتیبہ کی روایت میں ہے یہ سن کر عبداللہ(بن عمر) چلے اور نافع ان کے ساتھ تھے اور ابن رمح کی روایت میں ہے نافع نے کہا عبدللہ بن عمر چلے اور میں ان کے ساتھ تھا اور بنو لیث کا وہ شخص بھی ساتھ تھا یہاں تک کہ ابو سعید خذری کے پاس پہنچے ۔عبداللہ بن عمر نے کہا: مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم کہتے ہو کہ اللہ کے رسول ﷺ نے چاندی کے بدلے چاندی کی فروخت منع کی ہے سوائے اس صورت کے کہ وہ مثل بہ مثل ہو اور سونے کے بدلے سونے کی فروخت سوائے اس صورت کے کہ وہ مثل بہ مثل ہو۔ابو سعید خذری نے اپنی آنکھوں اور اپنے کانوں کی طرف اپنی انگلیوں سے اشارہ کرکے کہا کہ : کہ میری آنکھوں نے دیکھا اور میرے کانوں نے اللہ کے رسول ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ سونے کے بدلے سونے کو نہ بیچو اور چاندی کے بدلے چانی کو نہ بیچو سوائے اس صورت کہ وہ مثل بہ مثل ہوں اورکچھ پر کچھ کا اضافہ نہ کرو اور نقد جنس کو اس کے بدلے میں مت بیچو جو حاضر نہیں سوائے اس کے کہ سودا دست بدست ہو۔

(5) صحیح مسلم ، کتاب 010، حدیث نمبر 3848:ابو سعید خذری روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے اللہ کے رسول کو یہ کہتے ہوئے سنا : سونے کو سونے کے بدلے اور چاندی کو چاندی کے بدلے نہ بیچو مگر یہ کہ وہ وزن میں برابر برابر یا ایک ہی کو لٹی کے ہوں۔

(6) صحیح مسلم ، کتاب 010، حدیث نمبر 3849:حضرت عثمان بن عفان روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے اللہ کے رسول ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا :ایک دینار کو دو دینار کے بدلے اور ایک درہم کو دو دینار کے بدلے مت بیچو۔

(7) صحیح مسلم ، کتاب 010، حدیث نمبر 3850:مالک بن اوس بن حدثان نے رویت کی : میں یہ کہتے ہوئے باہر نکلا کہ کون ہے جو (میرے سونے کے بدلے)درہموں کا تبادلہ کرنا چاہتا ہے، جس پر طلحہ بن عبید اللہ جو حضرت عمر کے پاس بیٹھے ہوئے تھے نے کہا: ہمیں پہلے اپنا سونا دکھائیں پھر ہمارے پاس آئیں۔جب ہمارا نوکر آئے گا ہم تمہیں تمہاری چاندی(درہم جو تمہارے بنیں گے) دے دیں گے۔ اس پر حضرت عمر بن خطاب نے کہا: ہرگز نہیں۔ اللہ کی قسم یا تو تم اس کو اس کی چاندی(سکے) واپس کرو یا اس کا سونا اس

کو واپس لوٹادو کیونکہ اللہ کے رسول ﷺ فرماتے تھے کہ چاندی کو سونے سے بدلنے میں ربا (کا عنصر) شامل ہے سوائے اس کے کہ سودا (تبادلہ)موقع پر ہو؛ اور گیہوں کا تبادلہ گیہوں سے ربا ہے سوائے اس کے کہ دونوں کا تبادلہ موقع پر ہوجو کا تبادلہ جو سے ربا ہے سوائے اس کے کہ دونوں کا تبادلہ موقع پر ہو: کھجور کاتبادلہ کھجور سے رباہے سوائے اس کے کہ دونوں کاتبادلہ موقع پر ہو:

(8) صحیح مسلم ، کتاب 010، حدیث نمبر 3852:حضرت ابو قلابہ سےروایت ہے: میں شام میں اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ تھا اتنے میں ابوعشعث ہمارے پاس آیا۔لوگوں نے کہا وہ بیٹھ گیا۔میں نے اسے کہا: ہمارے بھائی عبادہ بن صامت کی حدیث بیان کرو۔اس نے کہا کہ ہاں ہم ایک جہاد پر گئے ہوئے تھے اس میں معاویہ سردارتھے ۔ہمیں اس جنگ سے بہت سارا سامان مال غنیمت کے طور پر ملا۔ان میں ایک برتن چاندی کا بھی تھا۔حضرت معاویہ نے اس کولوگوں کی تنخوہ پر بیچنے کا حکم دیا اور لوگوں نے جلدی کی اس کے لینے میں۔یہ خبر عبادہ بن صامت تک پہنچ گئی اور وہ کھڑے ہوگئے اور کہا کہ میں نے اللہ کے رسول ﷺ کو سونے کے بدلے سونے ، اور چاندی کے بدلے چاندی،اور گندم کے بدلے گندم، اورجو کے بدلے ، اور کھجور کے بدلے کھجور اور نمک کے بدلے نمک فروخت کرنے سے منع کرتے ہوئے سنا ، سوائے مثل بہ مثل اور برابر برابر اور نقدکے۔سو جس کسی نے بھی مبادلے میں زیادہ لیا یا زیادہ دیا وہ ربا کا مرتکب ہوا۔ پس لوگوں نے جو لیا تھا وہ واپس کردیا۔ یہ خبر جب معاویہ تک پہنچی تو وہ خطاب کرنے کے لئے کھڑے ہوگئے ۔ انہوں نے فرمایا کہ لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ ہے کہ وہ پیغمبر ﷺ سے وہ حدیث روایت کرتے ہیں جو ہم نے نہیں سنی اگرچہ ہم نے ان کو دیکھا اور ان کی صحبت میں رہے؟اس پر عبادہ بن صامت کھڑے ہوگئے اور اس روایت کو دہرایا اور پھر کہا: ہم یقیناً اسے بیان کریں گے جو ہم نے اللہ کے رسول سے سنا، چاہے وہ معاویہ کو ناگوار ہی کیوں نہ گذرے(یا انہوں نے کہا: چاہے یہ ان کی خواہش کے برعکس ہی کیوں نہ ہو)۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے کہ اگر میں اندھیری رات میں ان کے دستے میں نہیں رہوں گا۔حماد نے یہ کہایاپھر کچھ ایساہی کہا۔

(9) صحیح مسلم ، کتاب 010، حدیث نمبر 3853:عبادہ بن صامت اللہ کے رسول ﷺ کو یہ کہتے ہوئے روایت کرتے ہیں : سونے کی ادائیگی سونے سے ، چاندی کی چاندی سے، گندم کی گندم سے، جو کی جو سے ،

کھجوروں کی کھجوروں سے ، نمک کی نمک سے مثل بہ مثل اور برابر برابر اور ادئیگی دست بدست ہونی چاہیئے۔ اگر یہ اقسام مختلف ہو جائیں تو جس طرح چاہے بیچو مگر ادائیگی دست بدست ہونی چاہیے۔

(10) صحیح مسلم ، کتاب 010، حدیث نمبر 3854:ابو سعید خذری اللہ کے رسول ﷺ کو یہ کہتے ہوئے روایت کرتے ہیں :سونے کی ادائیگی سونے سے ، چاندی کی چاندی سے، گندم کی گندم سے، جو کی جو سے ، کھجوروں کی کھجوروں سے ، نمک کی نمک سے مثل بہ مثل اور برابر برابر اور ادئیگی دست بدست ہونی چاہیئے۔ جس نے اس میں اضافہ کیا یا اضافے کا مطالبہ کیا اس نے حقیقتاً ربا کا معاملہ کیا۔ لینے اور دینے والا دونوں مجرم ہوں گے۔

(11) صحیح مسلم ، کتاب 010، حدیث نمبر 3856:ابو ہریرہ اللہ کے رسول ﷺ کو یہ کہتے ہوئے روایت کرتے ہیں : کھجوروں کی ادائیگی کھجوروں سے ، گندم کی گندم سے، جو کی جو سے ، نمک کی نمک سے مثل بہ مثل اور ادئیگی موقع پر ہونی چاہیئے۔ جس نے اس میں اضافہ کیا یا اضافے کا مطالبہ کیا اس نے حقیقتاً ربا کا معاملہ کیاسوائے ان صورتوں کے جن میں ان کی جنس بدل جاتی ہو۔ اس حدیث کو فضیل بن غزوان کی سند سے بھی انہی راویوں کے ناموں کے ساتھ بیان کیا گیا ہے مگر اس میں دست بدست ادائیگی کا ذکر نہیں ہے۔

(12) صحیح مسلم ، کتاب 010، حدیث نمبر 3857: ابو ہریرہ اللہ کے رسول ﷺ کو یہ کہتے ہوئے روایت کرتے ہیں : سونے کی ادائیگی سونے میں ہونی چاہیئے وزن میں برابر برابر اور مثل بہ مثل ، اور چاندی کے ادائیگی چاندی میں ہونی چاہیئے وزن میں برابر برابر اور مثل بہ مثل۔جس نے اضافہ کیا یا اضافے کا مطالبہ کیا اس نے ربا کا معاملہ کیا۔

(13) صحیح مسلم ، کتاب 010، حدیث نمبر 3857: ابو ہریرہ اللہ کے رسول ﷺ کو یہ کہتے ہوئے روایت کرتے ہیں :دینا کو دینار کے ساتھ بدلنا چاہیئے کسی طرف سے بھی اضافہ نہیں ہونا چاہیئے اور درہم کو درہم کے ساتھ بدلنا چاہیئے کسی طرف سے بھی اضافہ نہیں ہونا چاہیئے۔ اس حدیث کو موسیٰ بن تمیم کی سند اور انہی راویوں کی وساطت سے روایت کیا گیا ہے۔

(14) صحیح مسلم ، کتاب 010، حدیث نمبر 3859: ابو منہال سے روایت ہے: میرے ایک شراکت دار نے چاند ی بیچی ادھارحج کے موسم تک، وہ مجھ سے پوچھنے آیا میں نے کہا یہ تو درست نہیں اس نے کہا میں نے یہ بازار میں (ادھار پر) فروخت کی ہے اور کسی نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ پھر میں براء بن عازب کے پاس گیا اور ان سے اس کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے کہا کہ اللہ کے رسول ﷺ مدینہ میں تشریف لائے اور ہم ایسی بیع کیا کرتے تھے آپ نے فرمایا کہ اگر نقد ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں اور جو ادھار ہو تو ربا ہے اور بہتر ہے تم زید بن ارقم کے پاس جاؤ اس کو سوداگری مجھ سے زیادہ آتی ہے(وہ اس مسئلہ میں بخوبی واقف ہونگے)۔ سو میں ان کے پاس گیا اور ان سے پوچھا تو انہوں نے اسی طرح کا جواب دیا۔

(15) صحیح مسلم ، کتاب 010، حدیث نمبر 3860: حبیب نے روایت کیا کہ انہوں نے ابو منہال کو کہتے ہوئے سنا : میں نے براء بن عازب سے(سونے کو چاندی سے یا چاندی کو سونے سے) تبادلے کے بارے میں پوچھا، جس پر انہوں نے کہا کہ بہتر ہے تم زید بن ارقم سے اس بارے میں پوچھو کیونکہ وہ مجھ سے زیادہ جانتا ہے۔پس میں زید بن ارقم کے پاس گیا لیکن انہوں نے کہا بہتر ہے تم براء سے اس بارے میں پوچھو کیونکہ وہ مجھ سے زیادہ جانتا ہے۔تب ان دونوں نے کہا اللہ کے رسول ﷺ نے اس صورت میں چاندی کو سونے کے بدلے بیچنے سے منع کیا ہے جب قیمت آئندہ(ادھار)ادا کرنی ہو۔

(16) صحیح مسلم ، کتاب 010، حدیث نمبر 3861:عبدالرحمٰن بن ابو بکر اپنے باپ کی سند سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے سونے کو سونے کے بدلے اور چاندی کو چاندی کے بدلے بیچنے سے منع کیا ہے الا یہ کہ وہ برابر برابر ہوں اور ہمیں سونے کے بدلے چاندی اور چاندی کے بدلے سونا اپنی مرضی کے مطابق جیسا ہم چاہیں خریدنے کی اجازت دی ۔ ایک شخص (ادائیگی کی نوعیت کے بارے میں)نے پوچھاجس پر انہوں نے کہا کہ ادائیگی موقع پر ہی کرنی چاہیئے۔یہی میں نے(رسول اللہ ﷺ)سے سنا۔

(17) صحیح مسلم ، کتاب 010، حدیث نمبر 3877:عبیداللہ بن ابو یزید نے ابن عباس کو یہ کہتے ہوئے سنا: اسامہ بن زید نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا:ادھار میں رباہو سکتا ہے۔

(18) صحیح مسلم ، کتاب 010، حدیث نمبر 3878:ابن عباس نے اسامہ بن زید کی سند سے روایت کیا کہ انہوں نے اللہ کے رسول ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے روایت کیا: جب رقم یا جنس کا تبادلہ دست بدست کیا جائے تو اس میں کوئی ربا نہیں ہوتا۔

(19) سنن ابو داؤد ، کتاب 22، حدیث نمبر 3343:عبادہ بن صامت روایت کرتے ہیں: اللہ کے رسول ﷺ نے کہا سونے کے بدلے سونا ادا ہونا چاہیئے، چاہے خام صورت میں ہو یا سکوں میں ڈھلا ہوا، چاندی کے بدلے چاندی، چاہے خام صورت میں ہو یا سکوں میں ڈھلی ہوئی(وزن میں برابر برابر)، گندم کے بدلے گندم ماپ میں برابر برابر، جو کے بدلے جو ماپ میں برابر برابر، کھجوروں کے بدلے کھجور ماپ میں برابر برابر، نمک کے بدلے نمک ماپ میں برابر برابر، ؛ اگر کوئی زیادہ دے یا کوئی زیادہ مانگے، اس نے ربا کا معاملہ کیا۔ لیکن سونے کو چاندی کے بدلے یا چاندی کو سونے کے بدلے غیر مساوی وزن میں بیچنے میں کوئی حرج نہیں ہے بشر طیکہ ادائیگی موقع پر ہونی چاہیئے۔ اگر ان کی ادائیگی بعد میں کرنی ہو تو نہ بیچو۔اسی طرح گندم کو جو کے بدلے یا جو کو گندم کے بدلے غیر مساوی ماپ میں بیچنے میں کوئی حرج نہیں، بشر طیکہ ادائیگی موقع پر ہونی چاہیئے۔ اگر ادائیگی بعد میں کرنی ہو تو انہیں نہ بیچو۔

9.3 ۔مندرجہ بالا تمام احادیث کا جائزہ قرآن کی روشنی میں لیا جانا ضروری ہے۔جیسا کہ پچھلے باب میں بھی کہا جاچکا ہے اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو ہمارے بھٹک جانے کا اندیشہ رہے گا۔ اس لئے یہاں پر پھر اس الٰہی روشنی کا اعادہ کیا جاتا ہے جس پر باب نمبر 1 میں بحث کی گئی تھی کہ الربا سوائے اس ظلم اور بے انصافی کے کچھ نہیں ہے جس کا امکان انسانوں کے درمیان باہمی لین دین میں اکثر رہتا ہے۔

9.4۔ کھجوروں کی طرح باقی اشیاء مثلاً گندم، جو، نمک،سونا چاندی وغیرہ وغیرہ جن کا ذکر پیرا گراف 9.2 کے تحت خصوصی طور پر کیا گیا ہے میں بھی ایسی بے انصافیوں سے بچنے کے لئے ہی رسول اللہ ﷺ مثل بہ مثل ، برابر برابر اور دست بدست کا اصول ہی متعین فرمارہے ہیں۔ ہم پچھلے باب میں کھجوروں کی مثال لے کر مثل بہ مثل اور برابر برابر کی اہمیت پر بحث کر چکے ہیں۔اس باب میں ہم دست بدست یعنی نقد انقد کو زیر بحث لائیں گے۔

9.5۔ بلا شبہ دست بدست کا مطلب موقع پر یا فورًا ہی ہوتا ہے۔ اس جملے کے سیاق و سباق میں احادیث کی اہمیت یہی بنتی ہے کہ مثل بہ مثل کا تبادلہ تبھی الربا کے بغیر ہوسکتا ہے جب دونوں طرف سے اشیاء کا تبادلہ فورًا ہوجائے۔

دوسرے الفاظ میں اگر پچھلے ہفتے میں نے اپنے ہمسایے سے ایک کلو گرام گندم ادھار لی تھی اور اگر اسی کوالٹی کی اتنی ہی مقدار میں گندم میں آج اسے واپس کرتا ہوں تو مندرجہ بالا احادیث کی روشنی میں اس میں بھی الربا ہو سکتا ہے۔ لیکن سوال ہے کہ آخر کیوں؟

9.6۔ سوال یہ ہے کہ آخر کیوں اس میں الربا ہو سکتا ہے!تمام مرتب اور مسلمہ اصولوں کے مطابق یہ تبادلہ مکمل طور پر صحیح تصور کیا جانا چاہیئے۔ اور مجھے کوئی ایسا تجزیہ بھی کہیں سے نہیں مل سکا جو اس مسئلے پر روشنی ڈال سکے۔ کیا قرآن نہیں کہتا کہ "لَکُمْ رُءُسُ اَمْوَالِکُمْ" (البقرہ:279)۔اور کیا میں نے اس کے مطابق اپنے پڑوسی کے اموال واپس نہیں لوٹا دیئے؟ تو پھر اس مبادلہ یا لین دین میں الربا کا عنصر کیوں ہو سکتا ہے؟

9.7۔ ایسے مبادلات یا لین دین(جن میں چیزوں کو ادھار لینے کے کچھ عرصہ بعد لوٹایا جائے)کے مضمرات کو سمجھنے کے لئے آئیں ایک مثال پر غور کرتے ہیں۔ فرض کریں کہ میں گندم کا ایک تھوک کا بیوپاری ہوں ۔ میرا سٹاک ختم ہو جاتا ہے اور مجھے گندم سپلائی کرنے والا ایک ہفتے کے بعد ہی تازہ سٹاک بھیج سکتا ہے۔ ایسی صورت میں مجھے میرے ایک پرانے اور قابل قدر گاہک کی طرف سے ایک دس ہزار کلو گرام گندم کی سپلائی کا آرڈر وصول ہوتا ہے ۔ میں اس آرڈر کو پورا کرنے کے لئے ایک دوسرے بیوپاری سے گندم کی مطلوبہ مقدار ادھار لے لیتا ہوں۔لیکن اس ہفتے گندم کی مانگ میں اتنی تیزی سے اضافہ ہوتا ہے کہ اس بیوپاری کے اپنے سٹاک بھی ہفتے کے دوران ہی ختم ہو گئے جس نے مجھے گندم ادھار دی تھی۔ اس لئے وہ اپنے گاہکوں کے آرڈرز بھی پورے کرنے سے قاصر رہا اور اس کے پرانے اور مستقل گاہک دوسرے سپلائرز کے پاس چلے گئے۔

9.8۔ اب ان حالات میں ،اگر میں اپنے ساتھی بیوپاری کو اتنی ہی اور اسی کوالٹی کی گندم ایک ہفتہ بعد واپس کر بھی دوں تو کیا میرے اس ساتھی بیوپاری کو نقصان نہیں ہوا ؟ کیا اس کے ساتھ ظلم نہیں ہوا؟ اور قرآن کہتا ہے کہ نہ ادھار لینے والے پر اور نہ ادھار دینے والے پر ظلم ہونا چاہیئے(البقرہ:279)۔ حقیقت میں میری وجہ سے میرے ایک ساتھی بیوپاری کے ساتھ معاشی نا انصافی ہو گئی۔ دوسرے لفظوں میں سورہ الروم کی آیت نمبر 39 کے مطابق میں الربا کا مرتکب ہو گیا۔

9.9۔ اسی قسم کی معاشی ناانصافی یا الربا کا امکان میرے اس پڑوسی کے معاملے میں بھی ہو سکتا ہے جس کو میں ایک ہفتہ بعد ایک کلو گرام گندم واپس لوٹاتا ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ ایک اچھا پڑوسی ہوتے ہوئے مروت کی وجہ سے

اس چھوٹی سی ناانصافی کو نظر انداز کر دے لیکن اللہ تو مجھے ہر وقت دیکھ رہا ہے۔ اور اگر میں حقیقتاً اس خوف ناک تنبیہ سے ڈرتا ہوں کہ الربا لینے والوں کے خلاف اللہ اور اس کے رسول کا اعلان جنگ ہے(البقرہ:279)، تو مجھے اس ایک کلو گرام سے کچھ زیادہ گندم واپس لوٹانا چاہیئے، چاہے مجھے یہ خفیہ طور پر ہی کیوں نہ کرنا پڑے کیوں کہ ایک اچھے پڑوسی ہونے کے ناطے سے مجھے اپنی اس حرکت پر ضرور اس کی طرف سے احتجاج کی توقع ہونی چاہیئے۔

9.10۔ اس سے ہمارے ذہنوں میں ایک سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ ایسی صورت میں کتنا زیادہ دیا جانا چاہیئے۔ اس طرح کے چھوٹے چھوٹے معاملات میں ٹھیک ٹھیک اندازہ لگانا نہ تو عملی طور پر ممکن ہوتا ہے اور نہ ہی ضروری۔ اللہ بہت بڑا ہے، رحم کرنے والا اور مہربان بھی۔ وہ ہمارے اچھے ارادوں سے خوب واقف ہے۔ وہ ہماری ایسی چھوٹی چھوٹی غلطیوں(جو ہماری بد دیانتی پر مبنی نہ ہوں) کو معاف کرتا رہتا ہے جو اس طرح کے معاملات میں ہم سے سرزد ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن ہمیں اس قسم کی غلطیوں سے بچنے کی کوشش کرتے رہنا چاہیئے۔

9.11۔ وہ احادیث جن کا تذکرہ اس باب میں اوپر کیا جا چکا، قرآن کی روشنی میں ہماری رہنمائی اس نتیجہ کی طرف کرتی ہیں کہ اگر قرضہ کچھ عرصہ گذرنے کے بعد مثل بہ مثل اور برابر برابر یعنی اسی مقدار اور اسی کوالٹی میں واپس کیا جائے تو یہ الربا کا معاملہ ہو سکتا ہے۔ لیکن ہماری یہ بہت بڑی بد قسمتی ہے کہ ہم ایسے الربا کے معاملات کو حقیقی نیکی کی معراج سمجھتے ہیں——اور وہ بھی اسلام کے نام پر۔

9.12۔ یہاں پر یہ دلیل دی جاسکتی ہے کہ مذکورہ احایث اشیاء کو ادھار پر دینے یا لینے کے بارے میں نہیں بلکہ ان کی فروخت کے بارے میں ہیں۔ لیکن ان دونوں قسم کے لین دین میں فرق کیا ہے؟ فروخت کرنے کی صورت میں اشیاء کا تبادلہ موقع پر ہوتا ہے، جبکہ ادھار لین دین میں، مبادلہ کے دونوں حصوں میں وقت کا ایک وقفہ ہوتا ہے --اگر ایک پارٹی دوسری پارٹی کو اب اشیاء دیتی ہے تو دوسری پارٹی اس کے بدلے میں اشیاء کچھ عرصہ بعد دیتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں ادھار کا لین دین اشیاء کو قرضے پر ہی تو فروخت کرنا ہوتا ہے۔ اور حضرت محمد ﷺ کی اوپر بیان کردہ احادیث کی رو سے قرضے میں الربا کا عنصر ہو سکتا ہے۔

9.13۔ ایک اور بڑی دل چسپ حدیث ہے جس کا حوالہ اس سلسلہ میں دیا جاسکتا ہے اگرچہ اس حدیث کی سند رسول اللہ ﷺ تک نہیں پہنچتی۔ یہ حدیث درج ذیل ہے۔

(20) موطا امام مالک، کتاب 31، حدیث نمبر 31.43.93: اور مالک نے مجھ سے بیان کیا انہوں نے سنا کہ ایک آدمی عبداللہ ابن عمر کے پاس آیا اور بولا " ابو عبدالرحمٰن ، میں نے ایک آدمی کو قرضہ دیا اور شرط رکھی کہ وہ مجھے اس سے بہتر دے گا جو میں نے اسے دیا تھا" عبداللہ ابن عمر نے کہا "یہ تو الربا ہے"عبداللہ نے کہا قرضے تین قسم کے ہوتے ہیں:1۔ مفت قرضہ جس کو تم اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے دیتے ہو اور اللہ کی خوشنودی تمہیں حاصل ہو جاتی ہے؛2۔مفت قرضہ جس کے ذریعہ تم اپنے دوست کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے ہو اور دوست کی خوشنودی تم کو حاصل ہو جاتی ہے؛3۔ اور مفت قرضہ جس کے ذریعے سے تم پاک مال کے بدلے میں ناپاک مال لیتے ہو اور وہ الربا (Usury) ہے۔ اس نے پوچھا " اے ابو عبدالرحمٰن پھر آپ مجھے کیا کرنے کا حکم دیتے ہیں؟"انہوں نے کہا " میرا خیال ہے کہ تم معاہدے کو پھاڑ دو۔ اگر وہ تمہیں وہی گندم دیتا ہے جو تم نے اسے دی تھی تو قبول کر لو۔ اگر وہ تمہیں اس سے کم گندم دیتا ہے جو تم نے اسے دی تھی تو لے لو اللہ تمہیں اجر دے گا۔ اگر وہ تمہیں اپنی مرضی سے اس سے اچھی گندم دیتا ہے جو تم نے اسے دی تھی ، یہ اس کی طرف سے تمہارا شکریہ ہو گا اور تمہیں اس عرصے کا معاوضہ مل جائے گاجتنے عرصے کے لئے تم نے اسے گندم قرض دی۔

9.14 ۔اس حدیث پر بحث کرنے سے پہلے یہ واضح کردینا ضروری ہے کہ یہ حدیث پیغمبر ﷺ کی زبان مبارکہ سے روایت نہیں کی جارہی بلکہ اس میں پیغمبر ﷺ کے ایک جید صحابی حضرت عبداللہ بن عمر کی رائے بیان کی جارہی ہے ۔ اس رائے کے مطابق قرضہ کے معاہدہ میں اس شرط کار کھا جانا ــــــــــــــ کہ ادھار لینے والا اس سے بہتر دے گا جو ادھار دینے والے نے اسے دیا تھا ـــ الربا کے زمرے میں آتا ہے۔ آئیں اس رائے کا قرآن کی روشنی میں جائزہ لیتے ہیں۔

9.15۔ قرآن کہتا ہے "وَاِنۡ تُبۡتُمۡ فَلَکُمۡ رُءُوۡسُ اَمۡوَالِکُمۡ لَا تَظۡلِمُوۡنَ وَلَا تُظۡلَمُوۡنَ"(البقرہ:279)اور اگر تم توبہ کرلو تو تم حق دار ہو اصل اموال کے واجبات کے ،نہ تم ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے ۔ پس قرض دینے والا نہ صرف اس کے برابر واپس لینے کا حق دار ہے جو اس نے ادھار دیا تھا بلکہ وہ بھی لینے کا حقدار ہے جو اس نے ادھار دے کر کھویا بصورت دیگر اس پر ظلم ہو گا جیسا کہ پیراگراف 9.7 اور 9.8 میں اوپر بیان کیا جاچکا ہے۔ اس طرح سے یہ دونوں اموال یعنی وہ مال جو ادھار دیا گیا اور جو مال ادھار کے دوران کھویا گیا ادھار دینے والے کے اصل مالی واجبات " رُءُوۡسُ اَمۡوَالۡ "ہیں۔زیر بحث حدیث میں یہی اصل مالی واجبات مراد تھے۔اگر قرضے کے معاہدے میں یہ بات لکھی جاتی کہ قرض دار ان اصلی مالی واجبات سے زیادہ دے گا تو یہ زیادہ ادائیگی الربا متصور ہوتی۔

9.16۔ عبداللہ بن عمر کی یہ رائے جو قرآن کی روشنی میں بنی اوپر بیان کردہ پیراگراف نمبر 9.2 میں بیان کردہ حدیث نمبر 17 سے مطابقت رکھتی ہے جہاں رسول اللہ ﷺ نے یہ کہا تھا کہ ادھار میں الربا کا عنصر ہوسکتا ہے ۔ پیرا گراف نمبر 9.13 میں زیر بحث حدیث نمبر 20 میں بھی الربا کا عنصر اس نقصان کے برابر ہوسکتا ہے جو قرض لینے والے کو قرض کی واپسی کے وقت قرض کی محرومی وجہ سے ہوا۔

9.17۔ اس تشریح کو حدیث کے آخر میں کہے گئے عبداللہ بن عمر کے اپنے بیان سے بھی تقویت ملتی ہے۔کیونکہ ادھار لینے والے کی طرف سے اپنی رضامندی اور احسان مندی کے ساتھ زائد ادئیگی کو ادھار دینے والے کے لئے ادھار کی مدت کا معاوضہ مانا جاسکتا ہے ۔ اگر زائد ادئیگی ادھار کی مدت کا معاوضہ تھا تو پھر یہ الربا نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ اس کے جائز واجبات کا حصہ تھا جس کے بغیر قرض دینے والے پر ظلم ہوتا جیسا کہ اوپر پیراگراف 9.7 اور 9.8 میں مثالیں دی جاچکی ہیں۔ اگر وہ زیادتی یا معاوضہ الربا ہوتا تو قرض دینے والا اسے کبھی قبول نہ کرتا کیونکہ اسی باب کی اوپر بیان کردہ حدیث نمبر 10 کے مطابق الربا کے لینے والا اور دینے والا دونوں مجرم ہوتے ہیں۔

9.18۔اس باب میں بیان کی گئیں احادیث کا قرآنی روشنی میں جائزہ لینے سے مندرجہ ذیل نتائج بر آمد ہوتے ہیں:

1. مثل بہ مثل اور دست بدست معاملات میں الربا نہیں ہوتا۔ یہ ایک قسم کا معیار ہے جو پیغمبر ﷺ نے الربا کے لین دین کو چیک کرنے کے لئے مقرر فرمایا۔

2. اس معیار کے مطابق ادھار لین دین کے معاملات میں الربا کا عنصر اس صورت میں موجود ہوسکتا ہے جب مثل کے بدلے مثل فوری نہیں بلکہ ایک عرصہ کے بعد واپس کی جائے۔

3. اس صورت میں الربا کا عنصر شامل ہو سکتا ہے جب ادھار دینے والے کے لئے نقصان برداشت کرنے کا امکان یا احتمال موجود ہو۔

4. جب قرضہ جات شخصی سطح پر کاروبار کرنے کے لئے نہ لئے جائیں تو یہ مناسب نہیں ہو گا کہ کہ قرضہ دینے والا قرضہ کی مدت کا معاوضہ اپنی وصولی میں شامل کرے۔

5. لیکن قرضہ لینے والے کا یہ فرض بنتا ہے کہ قرض کی ادائیگی کے ساتھ مناسب اضافی رقم بھی دے دے بشرطیکہ اس کے اپنے حالات خراب نہ ہوں۔

6. حالات کی مجبوری کی وجہ سے اگر قرض دار باوجود مدت قرض میں دی گئیں توسیعات کے قرض کو جزوی یا کلی طور پر لوٹانے کے قابل نہ ہو تو قرض دینے والے کو قرض جزوی یا کلی طور پر جیسے بھی حالات ہوں معاف کر دینا چاہیئے۔ اسے یقین کامل ہونا چاہیئے کہ اللہ اس کو اس کا اجر دے گا۔

7. اگر قرض ایسی شے پر مشتمل ہو جس کا قرض دینے والا کاروبار کرتا ہے تو پھر قرض دینے والے کا یہ حق بنتا ہے کہ قرضے کی دستاویز میں اس بات کی گنجائش رکھی جائے کہ اگر قرضہ دینے والے کو قرضہ دینے سے کوئی نقصان ہو تو اس کی مناسب تلافی کی جاسکے۔ یہ تلافی اس کے جائز اموال کا حصہ ہو گی۔

10۔الربا سے متعلق احادیث۔IV

10.1۔اس باب میں ہم الربا سے متعلقہ ایسی احادیث پر غور کریں گے جن کی ابتدائی روایت خود حضرت محمد ﷺ کی ذات مبارکہ سے ہوتی ہے۔

(1)۔ صحیح مسلم، کتاب نمبر 010، حدیث نمبر 3863: فضالہ بن عبید انصاری روایت کرتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ کے پاس خیبر کے موقع پر ایک ہار جس میں سونا اور جواہرات جڑے ہوئے تھے لایا گیا۔ یہ ہار جنگ سے حاصل ہونے والے مال غنیمت میں سے تھا جسے فروخت کے لئے پیش کیا گیا تھا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے کہا: جو سونا اس میں استعمال ہوا ہے اسے علیحدہ کیا جائے، اور پھر فرمایا کہ سونے کو سونے کے بدلے بیچو برابر تول کر۔

(2)۔ صحیح مسلم، کتاب نمبر 010، حدیث نمبر 3864: حضرت فضالہ بن عبید سے روایت ہے کہ میں نے خیبر کے روز بارہ اشرفیوں میں ایک ہار خریدا، اس میں سونا تھا اور جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ جب میں نے سونا جدا کیا تو اس میں بارہ اشرفیوں سے زیادہ سونا نکلا۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا: ہار نہ بیچا جائے جب تک کہ اس کا سونا جدا نہ کیا جائے۔

(3)۔ صحیح مسلم، کتاب نمبر 010، حدیث نمبر 3866: حضرت فضالہ بن عبید سے روایت ہے کہ ہم خیبر کے دن رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے اور یہودیوں کے ساتھ معاملہ کرتے تھے ایک اوقیہ (چالیس درہم) سونے کا دو یا تین دیناروں کے بدلے، تب جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مت بیچو سونا سونے کے بدلے مگر تول کر برابر برابر۔

(4)۔ سنن ابوداؤد، کتاب نمبر 23، حدیث نمبر 3534: ابو عمامہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر کوئی اپنے بھائی کے لئے سفارش کرے اور وہ اس کو تحفہ پیش کرے جسے وہ قبول کر لے، وہ ربا کے دروازوں میں سے بڑے دروازے کے پاس جا پہنچا۔

(5)۔ سنن ابوداؤد، کتاب نمبر 41، حدیث نمبر 4858: سعید ابن زید سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ربا کی سب سے زیادہ مروجہ قسم ایک مسلمان کی عزت و آبرو کے خلاف تفصیل سے ناحق باتیں کرنا ہے۔

(6)۔ الموطا امام مالک، کتاب نمبر 31، حدیث نمبر 31.39.85: مجھ سے یحیٰ نے، یحیٰ نے مالک سے، مالک نے ابوزناد سے، اس نے اراج سے اس نے ابو ہریرہ سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ امیر آدمی سے ادائیگی میں تاخیر ناانصافی اور ظلم ہے، لیکن جب تم میں سے کوئی، کسی امیر آدمی کو ادائیگی کے لئے حوالہ کر دیا جائے تو پھر اسے حوالے کرنے دو۔

10.2۔ آیئے پہلے ہم اوپر والے پیراگراف میں بیان کردہ احادیث میں سے پہلی تین احادیث پر غور کرتے ہیں۔ ان تینوں حدیثوں کا تعلق فتح خیبر سے ہے جو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں یہودیوں کو گڑھ تھا، یہودی امیر تھے اور مسلمانوں کو اس فتح سے سونے چاندی اور جواہرات کی صورت میں اچھا خاصا مال غنیمت ملا تھا۔ مسلمان چونکہ ایک سادہ زندگی بسر کرنے کے عادی تھے اس لئے وہ اتنی مہنگی اشیاء کو خود استعمال میں نہیں لاتے تھے۔ پس انہوں ان اشیاء کو کیش کے بدلے انہی یہودیوں کو بیچنا شروع کر دیا۔ اور چونکہ مسلمان ان مہنگی اشیاء کی اصلی قدر و قیمت سے آگاہ نہیں تھے اس لئے انہوں نے ان کو ان کی اصلی قیمت سے بہت کم اونے پونے داموں بیچ دیا۔

10.3۔ جب رسول اللہ ﷺ کو اصل صورت حال کی خبر ہوئی ہو گی تو قدرتی طور پر انہوں نے مسلمانوں کو اس انداز میں مال غنیمت نہ اڑا دینے کا مشورہ دیا ہو گا۔ اور اسی سیاق و سباق میں زیر بحث احادیث کو روایت کیا گیا ہے۔

10.4۔ جو مشورہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو دیا وہ یہ تھا کہ مال غنیمت کے طور پر ملے ہوئے سونے کو سونے کے سکوں کے بدلے وزن میں برابری کی بنیاد پر بیچا جائے کم پر نہیں۔ یہ مشورہ بنیادی طور پر اس دولت کی لوٹ کو بند کرنے کے لئے دیا گیا تھا جو مسلمانوں کو غنیمت میں حاصل ہوئی تھی۔

10.5۔ پس ظاہر ہے کہ ان احادیث کو الربا کے مسئلہ سے جوڑنا غلط ہو گا۔ درحقیقت ان میں کہیں الربا کا ذکر ہے بھی نہیں۔ مزید یہ کہ الربا کو منع کرنے والی آیات فتح خیبر کے بعد نازل ہوئیں۔

10.6۔ تاہم الربا کے سلسلے میں ان احادیث کا ذکر غالبًا ایک اور حدیث کی وجہ سے آگیا۔ یہ حدیث عبید بن صامت سے مروی ہے جو انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد ایک خطاب کے دوران بیان کی۔ یہی حدیث باب نمبر 9 میں سیریل نمبر 8 پر بیان جا چکی ہے۔ اس میں عبید نے روایت کیا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو کچھ اور چیزوں کے علاوہ سونے کو سونے کے بدلے بیچنے سے منع کرتے ہوئے سنا ہے سوائے اس کے کہ وہ مثل بہ مثل اور برابر برابر ہو۔ عبید نے اس کے بعد یہ اضافہ بھی روایت کیا ہے، "پس جس کسی نے اس میں اضافہ کیا یا اضافہ کو قبول کیا اس نے الربا کا معاملہ کیا"۔ اس حدیث کو بیان کرنے کے انداز اور اس میں

موجود بحث سے صاف طور پر پتا چلتا ہے کہ اس حدیث میں اضافہ حضرت عبید کی اپنی رائے ہے نہ کہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث کا حصہ۔

10.7۔ اس کے باوجود بھی، اب ہم زیر بحث تینوں حدیثوں کو الربا پر موجود قرآنی آیات کی روشنی میں پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہاں تو جو اشیاء کوڑیوں کے بھاؤ بیچی جا رہی تھیں وہ جنگی مال غنیمت سے حاصل ہوئی تھیں۔ جنگ اس مال غنیمت کو حاصل کرنے کے لئے نہیں لڑی گئی تھی بلکہ اس کے کئی اور جائز اخلاقی اسباب تھے (یہ اسباب کیا تھے، وہ اس کتاب کے دائرہ کار سے باہر ہیں اس لئے ان پر یہاں بحث نہیں کی جارہی)۔ شکست کھانے والی فوج کی جو اشیاء میدان جنگ میں پیچھے رہ جاتی ہیں وہ جائز جنگی مال غنیمت کے طور پر فاتح فوج کا حق سمجھا جاتا تھا (ایسی اشیاء ہمیشہ ہی سے اور آج بھی فاتح فوج کا جائز حق سمجھا جاتا ہے)۔ اور جیسا کہ اس زمانے کا دستور تھا مال غنیمت، فاتح فوج کے سپاہیوں کے درمیان بطور ان کے جائز معاوضے کے تقسیم کر دیا جاتا تھا۔

10.8۔ پس مسلمانوں کے وہ حصے جو ان کو خیبر کی فتح سے حاصل ہونے والے مال غنیمت سے ملے تھے وہ ان کے جائز اموال تھے۔ اس لئے وہ اپنے ان حصوں کی حقیقی قیمت وصول کرنے کے حق دار تھے جو انہوں نے بیچے تھے۔ لیکن ان کی لاعلمی کی وجہ سے ان کو وہ قیمت نہیں ملی تھی جس کے وہ حق دار تھے۔ فروخت کرتے وقت ان سودوں میں مسلمانوں پر ظلم ہوا تھا۔ دوسری طرف خریداروں کو اس سے زیادہ ملا جو انہوں نے نقد رقوم کی صورت میں بیچنے والوں کو ادا کیا تھا۔ پس خریداروں کو بیچنے والوں یعنی مسلمانوں کے جائز اموال میں سے زائد مال مل گیا تھا۔ صاف طور پر خریدنے والوں نے سورہ الروم کی آیت نمبر 39 اور سورہ البقرہ کی آیت نمبر 279 کے مطابق الربا کے جرم کے ارتکاب کیا تھا۔ دوسری طرف مسلمان الربا سے متاثر ہوئے تھے، اس لحاظ سے ان پر ظلم ہوا تھا۔ اس لئے زیر نظر احادیث پر الربا کے سلسلے میں غور کیا جاسکتا ہے چاہے کوئی رائے اس کے خلاف ہی کیوں نہ جاتی ہو۔

10.9۔ پیراگراف 10.1 کی اگلی حدیث (نمبر 4) الربا کے قرآنی تصور کی مزید وضاحت کی ایک اور بہترین مثال ہے۔ یہ حدیث ظاہر کرتی ہے کہ رشوت کے طور پر دیئے گئے وہ تحائف بھی الربا کی تعریف میں آتے ہیں جن کے دینے کا آج کل، خاص طور پر ترقی پذیر ممالک میں بڑا رواج ہے۔ جب **الف** کسی چیز کے لئے **ب** کو رشوت دیتا ہے تو، **ب** جو چیز حاصل کرتا ہے وہ اس کے جائز واجبات یا اموال کا حصہ نہیں ہوتی۔ اس صورت میں **ب** یقینی طور پر **الربا** لینے کا مرتکب ہوتا ہے۔ اور اگر **الف** بدلے میں کچھ حاصل کرنے کے لئے **ب** کو رشوت دیتا ہے جس کا وہ مستحق نہیں ہے تو پھر **الف** بھی **الربا** لینے کا مجرم ٹھہرے گا بصورت دیگر **الف** **الربا** دینے کے جرم کا مرتکب ہو گا۔ لیکن ایک ایسا تحفہ جو کسی مالی منفعت کی توقع کے بغیر کسی جگری دوست کو خالصتاً محبت کی وجہ سے دیا جائے گا وہ **الربا** کے زمرے میں نہیں آئے گا۔

10.10۔ لیکن ممکن ہے وہ تحفہ جس کی مثال زیر بحث حدیث مبارکہ میں دی گئی ہے، سفارش کنندہ کو مخلصانہ محبت کی وجہ سے نہ دیا گیا ہو بلکہ وہ اس کی احسان مندی کے اظہار کے طور پر دیا گیا ہو۔ اس لئے تحفہ دینے والے کو مجرم قرار نہیں دیا جاسکتا۔ لیکن اگر سفارش کنندہ نے اس تحفہ کو اپنے بھائی سے قبول کر لیا تو پھر یہ سفارش ایک برادرانہ احسان مندی کے اظہار کا ذریعہ (Gesture) تصور نہیں کیا جائے گا۔ ہو سکتا ہے اس میں سفارش کنندہ کی اپنے بھائی سے سفارش کے بدلہ میں کچھ وصول کرنے کی نیت نہ ہو، لیکن جو نہی تحفہ قبول کیا جائے گا اسی وقت نیت کا اخلاص بھی بدعنوانی (Corruption) میں تبدیل ہو جائے گا۔

10.11۔ پس ایسے تحفے کی قبولیت کو بالکل بجا طور پر الربا کے دروازوں میں سے بڑے دروازے پر پہنچنا کہا گیا ہے۔ جیسا کہ اس کتاب میں پہلے بھی بتایا جا چکا ہے کہ الربا کے بہت سے دروازے ہیں۔ ان میں سے جس دروازے پر تحفہ کو قبول کرنے والا پہنچتا ہے اس کو اس لحاظ سے بڑا کہا گیا ہے کہ اس کے ذریعے سے نسبتاً بڑی آسانی کے ساتھ الربا کی گناہ آلود راجدھانی میں داخل ہوا جاسکتا ہے۔ ایسا تحفہ قبول کرنے والے شخص کی مثال اس حکومتی عہدیدار کی مانند ہوتی ہے جس کو شہریوں کی مدد کرنے کے فرائض سونپے جاتے ہیں۔ حکومت اس کو ان فرائض کی انجام دہی کے لئے مناسب معاوضہ بھی دیتی ہے لیکن پھر بھی ایسا عہدیدار اپنے معاوضے کی وصولی کے علاوہ ان شہریوں سے جن کی وہ مدد کرتا ہے تحائف قبول کرتا ہے! پس وہ تحائف اس کے جائز واجبات یا کمائی نہیں ہے اور ایسے تحائف کو قبول کرنا الربا میں ملوث ہونے کے زمرے میں ہی آئے گا۔

10.12۔ ایک بھائی کی مدد کرنا صدقہ کہلاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے احکامات کی رو سے اپنے بھائیوں کی مدد کرنا تمام لوگوں پر فرض قرار دیا گیا ہے۔ اس فرض کی ادائیگی کے صلے میں اللہ تعالیٰ نے بڑے بڑے انعامات کا وعدہ فرمایا ہے۔ اس لئے یہ نہایت ہی نا مناسب اور حد درجہ بدتہذیبی کی بات ہو گی کہ کوئی ایسے صدقہ (مدد) کے معاوضہ کے صلہ میں اپنے اس بھائی سے تحفہ قبول کرے جس کی اس نے مدد کی ہو۔ جب وہ کوئی ایسا تحفہ قبول کر لے گا، تو اس کو پھر مادی اشیاء کے ذریعے سے اپنے آپ کو امیر بنانے کا چسکا لگ جائے گا۔ جو اس کا جائز حق نہیں ہو گا۔ پھر وہ جلدی ہی اپنے آپ کو الربا کے معاملات میں غرق پائے گا۔ الربا کی راجدھانی میں اس کا داخلہ آسان ہو جائے گا اور کوئی ایسے انسانی قوانین نہیں ہونگے جو اسے ایسے تحائف قبول کرنے سے روک سکیں۔

10.13۔ اب پیراگراف میں 10.1 میں دی گئی حدیث نمبر 5 کے مطابق، ایک مسلمان کی عزت و آبرو اس کی زندگی کا اثاثہ ہوتی ہے۔ جو بھی اس کے خلاف بات کرتا ہے وہ حقیقتاً اس اثاثہ زندگی کو برباد کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کوئی کسی کی عزت و آبرو کو برباد کیوں کرتا ہے؟ اس کی کئی وجوہات اور امکانات ہوسکتے ہیں؛ جن میں دشمنی، رقابت، حسد، نفرت یا صرف دوسروں کی بے عزتی کرکے اپنی ذاتی خوشی کا حصول بھی شامل ہوتا ہے۔ یاد رہے کہ ایسے واقعات حقیقی زندگی میں رونما ہوتے رہتے ہیں اور اکثر یہ ان

لوگوں سے سرزد ہوتے ہیں جو بظاہر بڑے پارسا ہوتے ہیں۔ یہاں پر شیطان کے اس اعلان کو یاد کریں جو اس نے خالق کائینات کے حضور انسانوں کو گمراہ کرنے کے لئے کیا تھا۔ یقین مانیئے کہ جب مسلمان اپنے بھائیوں کی تحقیر و تذلیل کرتا ہے تو یہ کام سوائے شیطان کے کسی اور کا نہیں ہوتا۔

11.14۔ پھر حقیقتاً ہوتا کیا ہے کہ بے عزتی کرنے والا شخص بغیر کسی اختیار کے غیر منصفانہ طریقے سے اپنے مد مقابل شخص کے اثاثہ یعنی اس کی عزت پر ڈاکہ ڈالتا ہے اور اس سے غیر یقینی اور مشکوک خوشی حاصل کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اول الذکر موخر الذکر کے اموال (خوشیوں) کو غصب یا ہڑپ کرتا ہے۔ پس اول الذکر اپنے آپ کو الربا میں ملوث کر لیتا ہے۔ اور ایسا الربا یقیناً الربا کی تمام مروجہ اقسام سے بدترین ہوتا ہے کیونکہ آدمی کے مال و دولت کمانے کا اصل مقصد عزت کمانا ہی ہوتا اور اگر وہی داؤ پر لگ جائے تو الربا کی اور کون سی ایسی قسم ہوگی جو اس کے مقابلہ میں بری ہوگی۔

11.15۔ اب آیئے پیراگراف 10.1 کی حدیث نمبر 6 کی طرف۔ اگر کوئی امیر آدی کسی کو ادائیگی کرنے میں دیر کردے تو یہ اس حدیث کے مطابق ناانصافی ہوگی۔ اور چونکہ یہ ایک لین دین کی بے انصافی ہے، اس لئے، جیسا کہ ہم پہلے اسی کتاب میں دیکھ چکے ہیں قرآنی آیات کی روشنی میں یہ الربا ہے۔ لیکن اگر معاملہ الٹ ہو جائے یعنی امیر آدمی کو کسی اور سے وصولی کرنی ہو جو امیر نہ ہو، تب امیر آدمی سے کہا گیا ہے کہ وہ دوسرے آدی کو ادائیگی میں مزید مہلت دے اگر وہ مہلت مانگے۔ دوسری طرف امیر آدمی کی طرف یہ انصاف اور صدقے کا معاملہ ہوگا۔

11۔ بیمہ اور حقِ نقل و اشاعت

11.1۔ انشورنس یا بیمہ کو پوری دنیا میں ایک فلاحی اقدام کے طور پر اختیار کیا جاتا ہے۔ مثلاً زندگی کے بیمہ کی صورت میں بیمہ کمپنی ایک خاص رقم کے عوض ایک انسانی جان کی ضمانت دیتی ہے۔ جس شخص کی زندگی کا بیمہ کیا جاتا ہے (یا اس کی وساطت سے کسی اور زندگی کا بیمہ کیا جاتا ہے)، وہ بیمہ کمپنی کو بیمہ کی کل رقم کا ایک حصہ جس کو پریمیم کہا جاتا ہے باقاعدگی سے مختلف اقساط میں ادا کرتا ہے۔ پریمیم کی اقساط ایک خاص وقت تک ادا کی جاتی ہیں۔ ان پریمیم کی اقساط کی کل رقم، بیمہ کی کل رقم کے تقریباً برابر ہوتی ہے جس کے بدلے زندگی کی ضمانت دی گئی تھی۔

11.2۔ اب اگر بیمہ کے معاہدے کی مدت کے دوران وہ شخص فوت ہو جائے جس کی زندگی کا بیمہ کیا گیا تھا، تو بیمہ سے مستفید ہونے والا شخص کمپنی سے بیمہ کی کل رقم وصول کرنے کا حقدار ہوتا ہے چاہے بیمہ کی کل اقساط ابھی ادا نہ ہوئی ہوں۔ یہ بلا کسی شک وشبہ کے ایک فلاحی سکیم ہوتی ہے تاکہ بیمہ سے فائدہ اٹھانے والے شخص کو فوری طور پر مدد فراہم کی جاسکے، بصورت دیگر وہ بیمہ شدہ شخص کی موت سے مالی مشکلات کا شکار ہو سکتا تھا۔

11.3۔ ایسے معاملات میں ظاہر ہے بیمہ کمپنی کو مالی نقصانات اٹھانے پڑ سکتے ہیں۔ کوئی کمپنی بھی ایسے حالات میں مالی طور پر قائم رہ ہی نہیں سکتی بشرطیکہ وہ اپنے نقصانات پورا کرنے، کمپنی کو چلانے کے اخراجات برداشت کرنے اور ایک مناسب حد تک منافع حاصل کرنے کے لئے کوئی متبادل ذرائع استعمال نہ کرے۔

11.4۔ اس مقصد کے لئے، بیمہ کمپنی اپنے فنڈز کو دوسری کمپنیوں کے حصص کی خریداری اور فکسڈ ڈیپازٹس میں لگاتی ہے۔ پس اس کی آمدنی کا ایک حصہ سود کے ذریعے سے کمائی ہوئی رقم پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہی وہ سود کی رقم ہے جس پر ہمارے اسلامی اسکالرز اعتراض کرتے ہیں۔ ان کی دلیل یہی ہے کہ چونکہ سود (ان کے اپنے مطابق) اسلام میں حرام ہے، اس لئے بیمہ کمپنی کی آمدنی کا کچھ حصہ حرام پر مشتمل ہوتا ہے۔ پس جو رقم بھی بیمہ شدہ شخص کی موت پر ادا کی جاتی ہے وہ حرام ہے۔

11.5۔ ہم کافی تفصیل کے ساتھ اس کتاب میں دیکھ چکے ہیں کہ سود برائے خود اسلام میں حرام نہیں ہے۔ لہٰذا اس بنا پر بیمہ کو جو ایک فلاحی اقدام ہے، حرام کہنا ایک جھوٹ اور فریب کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہ جھوٹ اسلام کی بدنامی کا سبب بھی بنتا ہے۔ یہ انسان کی خود ساختہ ممانعت کے سوا کچھ نہیں جسے جھوٹ بول کر بڑے گستاخانہ طریقے سے اللہ کی جانب منسوب کر دیا جاتا ہے۔

11.6۔ اب آئیں حق نقل و اشاعت یعنی کاپی رائٹ کے بارے میں ۔ یہ ایک ایسا قانونی حق ہے جس کے تحت کسی بھی نئی شے (Product)[چاہے وہ مادی (Material) ہو یا دانشورانہ (Intellectual)] کے اصل موجد، خالق، معمار یا مصنف کو اس شے کی پیداوار پر بلاشرکت غیرے خصوصی طور پر حاصل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور کو یہ حق حاصل نہیں ہوتا تا آنکہ اس کا اصل موجد، خالق، معمار یا مصنف خود اس کی اجازت نہ دے دے۔

11.7۔ اسی طرح کاپی رائٹ کا قانون بھی کسی کتاب کے مصنف کے حقوق کا تحفظ کرتا ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ مصنف کی اجازت کے بغیر اس کی کتاب کی کاپیاں شائع کرے۔ بعض حلقے اسی بلاشرکت غیرے خصوصی حق پر اس کے غیر اسلامی ہونے کی چھاپ لگاتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال یہ بھی ہے کہ وہ رائلٹی جو بہت ہی مقبول کتابوں کے مصنف تا حیات وصول کرتے رہتے ہیں الربا کے زمرے میں آتی ہے۔

11.8۔ جیسا کہ اس کتاب میں ہم پہلے کئی بار دیکھ چکے ہیں، کہ الربا سے مراد دوسرے لوگوں کی املاک، کمائیاں اور واجبات غاصبانہ طریقے سے ہڑپ کرکے اپنے مال میں شامل کرنا ہے۔ کیا ایسا کچھ ہوتا ہے جب ایک مقبول کتاب کا مصنف تا حیات رائلٹی وصول کرتا ہے؟ کیا وہ اپنی اس کتاب کے کاپی رائٹس سے دست بردار ہو جائے اور وہ واجبات لینا بند کر دے جو اس کی ان دانشورانہ کوششوں کا نتیجہ ہیں جو اس نے کتاب کو معرض وجود میں لانے کے لئے صرف کیں؟ یہی وہ متنازعہ سوال ہے جس کا ہم یہاں پر جائزہ لیں گے۔

11.9۔ کتاب کی تخلیق یعنی پیداوار اور فروخت کے کاروبار میں مصنف (Author) کے علاوہ کئی اور لوگ بھی شامل ہوتے ہیں، جیسے کتاب کا چھاپنے والا (Printer)، ناشر (Publisher)، کتاب بیچنے والا (Book Seller) وغیرہ۔ کتاب کی قیمت کچھ عوامل کی بنیاد پر پیشگی مقرر کر دی جاتی ہے۔ ان عوامل میں کتاب کی ممکنہ تعداد فروخت، مصنف اور ناشر کے لئے مناسب معاوضے، چھپائی کے اخراجات اور کتاب بیچنے والے کا کمیشن وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔ اب اگر کتاب بہت زیادہ مقبول ہو جائے تو کتاب کی فروخت توقعات سے بڑھ جاتی ہے اور مصنف اور ناشر کے معاوضے متوقع اہداف سے بڑھ جاتے ہیں۔ کیا یہ اضافی آمدنی دوسرے لوگوں کے جائز واجبات کو ہڑپ کرنے کے مترادف ہو نگی؟

11.10۔ یہ کتاب کو پڑھنے والے ہی ہوتے ہیں جو بالآخر کتاب کے تمام اخراجات برداشت کرتے ہیں۔ الربا کا معاملہ اس وقت بنے گا جب کوئی ایک ایسا پڑھنے والا کتاب کی اصلی قدر یا افادیت (Real Worth) سے زیادہ قیمت ادا کرے گا۔ اگر کتاب کی قیمت کا

تعین مندرجہ بالا عوامل کو کامل دیانت داری کے ساتھ مد نظر رکھ کر کیا جائے گا تو یہ کبھی نہیں کہا جاسکے گا کہ کہ پڑھنے والا کتاب کی اصلی قدر سے زیادہ قیمت ادا کر رہا ہے۔

11.11۔ تاہم یہ دلیل ضرور دی جاسکتی ہے کہ جب کتاب کی فروخت اپنا ہدف پورا کرلے اور مصنف اپنے تمام واجبات وصول کر چکے، تو اس کے بعد کتاب کی مزید فروخت کے لئے اصلی ابتدائی قیمت میں سے مصنف کے واجبات منہا کر کے کتاب کی قیمت فروخت نئے سرے سے دوبارہ سے مقرر کی جائے۔

11.12۔ لیکن اس طرح سے کتاب کی قیمت کو دوبارہ سے از سر نو مقرر کرنا کئی لحاظ سے غیر مناسب، غیر منصفانہ اور ناقابل عمل کام ہوگا۔ یہاں پر یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ کسی کتاب کو معرض وجود میں لانے کے لئے سب سے بڑا حصہ مصنف کا ہی ہوتا ہے۔ اس لئے اس کی محنت کے پھل کی مزید ادائیگی کو بند کر دینا۔۔۔۔جب کہ دوسرے لوگوں کا جن کا کتاب کی تیاری میں نسبتًا کم حصہ ہوتا ہے اپنے معاوضے لگاتار وصول کرتے رہنا۔۔۔۔ایک غیر مناسب عمل ہوگا۔ اس کے علاوہ اگر اس کتاب کی نقول کو بعد میں کم قیمت پر فروخت کیا جائے گا تو کتاب کے سابقہ خریداروں کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ مزید برآں جب کتاب حقیقت میں مقبول ہو چکی ہے تو اس کے خریدار تو اس کی مقرر کردہ قیمت سے بھی زیادہ قیمت دینے کے لئے تیار ہونگے۔ ان حالات میں قیمت کا مزید کم کرنا چور بازاری کو جنم دے گا اور خریداروں کی رقوم کا ایک حصہ اس صورت میں الربا لینے والوں کے ہاتھوں چلا جائے گا۔

11.13۔ پس کتاب کی قیمت میں کمی مکمل طور پر غیر موثر ہو جائے گی۔ اور جب ایک غیر یقینی بنیاد پر کتاب کے مصنف کو اس کے خداداد بونس سے محروم کر دیا جائے گا تو اس صورت میں الربا اور حقیقی الربا لینے والوں کے لئے میدان کھلا رہ جائے گا۔

11.14۔ ایسی صورت میں ایک مصنوعی پابندی کے ذریعے سے کتاب کی فروخت کو محدود کر دینا ایک غیر منطقی عمل ہوگا، جس کی وجہ سے ہونے والے منافع جات میں سے مصنف کو اس کا جائز حصہ نہیں مل رہا ہوگا۔ ان حالات میں مصنف کے اوپر یہ الزام عائد کرنا بھی غیر منطقی ہوگا کہ وہ کتاب کے بے شمار خریداروں کے اموال میں سے اپنے آپ کو امیر بنانے کا متلاشی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہنا بھی غیر منطقی ہوگا کہ کتاب کی فروخت کو محدود کر دینے کے بعد بھی وہ منافع میں حصہ وصول کر کے الربا لینے میں ملوث ہو رہا ہے۔ در حقیقت یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اللہ تعالیٰ مصنف کو اس کی نیک کوششوں کی بنا پر ایک خصوصی بونس سے نواز رہا ہے۔

11.15۔ اللہ تبارک تعالیٰ یہ بونس دے کر حقیقتاً مصنف کا امتحان لے رہا ہوتا ہے۔ امتحان یہ ہوتا ہے کہ آیا مصنف اپنے فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں آسمانی احکامات کی پیروی کرتا ہے کہ نہیں۔ وہ احکام الٰہیہ جن میں حکم دیا گیا ہے کہ امیر لوگ، صدقات اور زکوٰۃ کے ذریعے سے، اس مال میں سے جو ان کی ضروریات سے زائد ہو ضرورت مندوں اور غریبوں پر خرچ کریں۔ ارشاد ہوتا ہے "۔۔۔وَيَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ، قُلِ الْعَفْوَ۔۔۔" (البقرۃ:219)۔ اور پوچھتے ہیں تم سے کہ کیا خرچ کریں (اللہ کی راہ میں) کہو جو زائد ہو (ضرورت سے)۔

11.16۔ جو نتیجہ ہم نے اوپر اخذ کیا ہے اس کا تعلق اس کتاب کے بارے میں ہے جو انسانوں کی سفلی جبلتوں کی تسکین کے لئے نہ لکھی گئی ہوں۔ جن کتابوں میں مثلاً فحش نگاری وغیرہ کی گئی ہو وہ کتابیں ہماری بحث کے دائرہ کار سے ہی باہر ہیں۔ اسلامی نقطہ نظر کے مطابق اس قسم کی کتابوں سے آمدنی مکمل طور پر حرام ہے۔

12۔ضمیمہ الف: سید امین الحسن رضوی کے مضمون ربا پر ایک تبصرہ

میرے ایک دوست نے مجھے سید امین الحسن رضوی کا ربا کے بارے میں انگریزی میں لکھا ہوا ایک مضمون بھیجا تھا جس کا ترجمہ مع تبصرہ نیچے پیش کیا جارہا ہے۔ یہ مضمون سعودی گزٹ میں 23 دسمبر 1996 اور 4 جنوری 1197 کی تاریخوں شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون ایک دوسرے نقطہ نظر کی نمائندگی کرتا ہے۔

مضمون:

سورہ البقرہ کی آیات نمبر 275، 276، 278؛ سورہ اٰلعمران کی آیت نمبر 130؛ سورہ النساء کی آیت نمبر 161 اور سورہ الروم کی آیت نمبر 39 میں ایک بہت ہی اہم لفظ ربا یا الربا کا ترجمہ تمام مترجمین نے غلط کرکے اسلام کے ایک بہت ہی اہم قانون کو توڑنے مروڑنے یا مسخ کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے ربا کا ترجمہ یوژری "Usury" کیا ہے۔ اب اس Usury کا ترجمہ ہر انگریزی لغت میں حد سے زیادہ (Exorbitant) یا بھاری (Excessive) سود کیا گیا ہے۔ اگر "Usury " کے لفظ کو ربا کا صحیح ترجمہ قبول کرلیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ اتنی شدید، پرزور اور بھیانک ممانعت صرف بھاری اور حد سے زیادہ سود لینے یا دینے کے لئے تھی اور برخلاف اس کے کم یا مناسب شرح پر سود لینے یا دینے کی اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہے! لیکن اس کے برعکس اللہ کا قانون بڑا شفاف اور واضح ہے: یہ ہر ایسی رقم لینے کی ممانعت کرتا ہے چاہے وہ کتنی ہی کم اور خفیف کیوں نہ ہو، جو قرضے پر دیئے گئے اصل زر (جسے عربی میں راس المال کہا جاتا ہے) سے زائد ہو اور جو رقم بھی راس المال سے زائد لی جائے اسے یہ ربا سے موسوم کرتا ہے جس کے لینے کو یہ بڑی سختی کے ساتھ منع کرتا ہے۔ عربی میں ایک ہی لفظ ربا ہے جو انگریزی کے دونوں لفظوں Usury اور Interest کی ترجمانی کرتا ہے۔ درحقیقت Usury کا لفظ انگریری میں بھی بعد میں متعارف ہوا ہے۔ سترھویں صدی میں جب بینکوں نے (اپنی ابتدائی صورت میں) انگلستان میں کام کرنا شروع کیا تو جس شرح پر بینک سود وصول کرتے تھے وہ شرح اس شرح سے بہت کم تھی جس سے ساہوکار سود وصول کیا کرتے تھے۔ بینکوں نے ساہوکاروں کے سود کو Usury کا نام دے کر اسے اپنے سود Interest سے ممتاز کردیا۔ لیکن اسلام اس قسم کی کوئی تمیز یا تفریق برداشت نہیں کرتا اور بڑی سختی کے ساتھ اصل زر سے اوپر کوئی بھی زیادتی وصول کرنے سے منع کرتا ہے چاہے یہ زیادتی دس ہزار روپوں کے اوپر ایک پائی ہی کی کیوں نہ ہو (یہ نسبت صرف مثال دینے کے لئے بیان کی گئی ہے)۔ سود اپنی تمام مختلف صورتوں میں، چاہے برائے نام ہو یا بھاری شرح سے استحصالی نوعیت کا، چاہے مفرد ہو یا مرکب اور چاہے پیداواری مقاصد کے لئے لیا گیا ہو یا صرفی مقاصد کے لئے مکمل طور پر منع (حرام) ہے۔ ربا کا

Usury ترجمہ کرنا شاید سورہ اٰلعمران کی آیت نمبر 130 کے سلسلے میں تو قبول کیا جا سکتا ہو جہاں پر "اَضۡعَافًا مُضَاعَفًا" یعنی دو گنے اور چو گنے کے الفاظ آتے ہیں اور جس کو اصطلاحی طور پر سود مرکب کہا جا سکتا ہے۔ لیکن دوسری آیات میں اس ترجمے کا دو وجوہات کی بنا پر کوئی جواز نہیں نکلتا۔ پہلی بات یہ کہ، سورہ الروم کی آیت نمبر 39 سود کو منع کرنے کے لئے نہیں اتاری گئی تھی بلکہ اس کا پس منظر مسلمانوں کی وہ ابتر حالت تھی جو جنگ احد (تین ہجری) کے نتیجے میں ہوئی تھی۔ اس آیت سے صرف دنیاوی رغبتوں سے کراہت دلانا مقصود تھا۔ دوسری یہ کہ، سورہ البقرہ کی آیت نمبر 275 میں آیا ہے "وَاَحَلَّ اللّٰہُ الۡبَیۡعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا" اور حلال کیا ہے اللہ نے تجارت کو اور حرام کر دیا ہے سود کو، جس میں بجائے خود سود کے لینے اور دینے کو دوٹوک الفاظ میں حرام یا منع قرار دے دیا گیا ہے۔ اب یہاں سے اور نہ ہی کسی اور آیت سے جس میں ربا کا لفظ استعمال ہوا ہے (سوائے سورہ اٰلعمران کی آیت نمبر 130 کے جس کا ذکر اوپر ہو چکا) ایسا کوئی کھلا اظہار نہیں ہو رہا ہے کہ اس سے مراد سود مرکب یا Usury ہے۔ پس قرآنی لفظ ربا کا Usury ترجمہ کرنا واضح طور پر اسلامی قانون کو مسخ کرنے یا اسے توڑنے مروڑنے کے مترادف ہے۔

کوئی بھی نتیجہ اخذ کرنے سے پہلے آئیں ربا کے ترجمہ Usury کی طرف لوٹتے ہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ربا کا Usury ترجمہ نادانستہ طور پر نہیں کیا گیا بلکہ یہ ترجمہ جان بوجھ کر Interest کو فوقیت دلوانے کے لئے کیا گیا ہے۔ Interest کی بجائے Usury کا استعمال میرے خیال میں مغربی فکر سے متاثر ہو کر کیا گیا ہے۔ وہ فاضل مترجمین اس بات پر بھی یقین رکھتے تھے کہ موجودہ دور میں Interest یعنی سود پر مبنی بینکاری اور دوسرے مالیاتی اداروں کے بغیر معیشت کے مختلف شعبے مثلاً تجارت، کاروبار، صنعت وغیرہ نہ صرف یہ کہ ترقی نہیں کر سکتے بلکہ ان کی بقاء ہی ممکن نہیں ہے۔ دوسری طرف ان کا سامنا قرآن پاک کے حتمی طور پر سود: Interest کو حرام کرنے والے اعلان سے تھا جن کو مستند احادیث سے مزید سہارا بھی مل رہا تھا۔ پس جب انہوں نے اپنے آپ کو ایسی پریشان کن صورت حال میں پایا تو انہوں نے خیال کیا کہ اگر الربا کا ترجمہ Interest کیا جائے تو اسلام پر ایک ایسے ناقابل عمل مذہب کا لیبل لگ جائے گا جو قرون وسطیٰ کے ایک ایسے جامد اقتصادی نظام کو سپورٹ فراہم کر رہا ہے جس میں تجارت اور صنعت کی خوشحالی اور ان کے پھلنے اور پھولنے کے کوئی امکانات ہی نہیں ہیں۔ اس تذبذب کی کیفیت سے باہر نکلنے کے لئے انہوں نے سوچا کہ ربا کا ترجمہ Usury کر دیا جائے تاکہ یہ کہا جا سکے کہ ربا صرف بھاری اور استحصالی شرح سود کو منع قرار دیتا ہے اور اس معتدل شرح سود کے لئے میدان کھلا چھوڑ دیا جائے جس پر بینک اور دوسرے مالیاتی ادارے قدیم زمانے کے ساہوکاروں کے مقابلے میں قرضہ دینے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ محمد اسد کو اس تذبذب کی کیفیت سے کافی حد تک آگاہی حاصل تھی اور اسی لئے انہوں نے سورہ الروم کی آیت نمبر 39 کے لئے ایک بہت لمبا وضاحتی نوٹ (نمبر 35) لکھا (کیونکہ سورہ الروم: سورہ البقرہ، سورہ اٰل عمران اور سورہ نساء سے ترتیب نزولی کے اعتبار سے پہلی سورہ ہے)۔ ایک جگہ پر اپنے وضاحتی نوٹ میں وہ کہتے ہیں "اس وقت یا اس

وقت سے پہلے کے مروجہ اقتصادی حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے، بہت سے مسلم فقہاء نے اس غیر قانونی اضافے کی نشاندہی ان منافعوں کی حیثیت سے کی ہے جو کسی بھی قسم کے سودی قرضوں کے ذریعے سے حاصل کئے جاتے ہیں قطع نظر اس سے کہ ان سودی قرضوں کی شرح کیا تھی اور ان میں کونسے اقتصادی محرکات شامل تھے"۔اسد اس نقطہ نظر کو صرف بہت سے قدیم مسلم فقہاء کی طرف منسوب کرتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ رائے سارے قدیم مسلم فقہا کی تھی۔اس کے علاوہ جو بات نوٹ کرنے کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ اسد اس کا اشارہ تک بھی نہیں دیتا کہ وہ اس معاملے میں قدیم فقہاء کے ساتھ ہے۔دوسری طرف اس کے متضاد نقطہ (کہ قرآن صرف حد سے زیادہ اور استحصالی شرح سود کو حرام کہتا ہے) نظر کا اظہار اسی نوٹ میں ہو جاتا ہے جب وہ کہتا ہے:"سود کی بدنامی---ان منافعوں سے منسلک ہوتی ہے جو طاقت ور اور وسائل رکھنے والے افرد سودی قرضوں کے ذریعے سے اقتصادی طور پر کمزور لوگوں کا استحصال کر کے حاصل کرتے ہیں---"مجھے اسد(Asad)، پامیر(Palmer)، سیلی(Sale)، اربیری(Arberry)، داؤد(Dawood)، پکتھل(Pickthal)، یوسف علی(Yousaf Ali) اور ارونگ(Irwing) پر اتنی حیرانی نہیں ہے جتنی ہلالی اور محسن(Hilali & Mohsin) پر ہے جنہوں نے اسی غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمارا اس پر کامل اور غیر متزلزل یقین ہونا چاہیئے کہ سود واقعی حرام ہے اور یہ کہ اللہ سود کو مٹاتا ہے(البقرہ:276)۔اور یہ کوئی محض خوش فہمی اور شیخی بھگارنا نہیں ہے۔صرف چند سال ہی نہیں بلکہ کئی صدیوں تک جب اسلام بر سر اقتدار تھا، معیشت مکمل طور پر سود سے پاک تھی اور بڑے اچھے طریقے سے ایسے پھلتی پھولتی بھی رہی کہ ہر طرف خوش حالی ہی خوش حالی تھی اور غربت بڑی حد تک ختم ہو چکی تھی۔خط غربت(آج کی اصطلاح میں) سے نیچے زندگی بسر کرنے والوں کا آسودہ حال لوگوں کے ساتھ تناسب آج کل کے ترقی یافتہ ممالک کی سود زدہ معیشتوں کے مقابلے میں بھی بہت کم تھا۔سپین کی فتح کے بعد مسلمانوں نے بڑے پیمانے پر بحری تجارت کی ابتدا کر دی تھی جس میں سود کا کوئی عنصر شامل نہیں تھا۔دوسری طرف ورلڈ بینک کی 96-1995 کی رپورٹ واضح طور پر اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ امیر اور غریب کے درمیان بڑھتی ہوئی معاشی ناہمواریوں کے بڑی وجہ سود ہے اور یہ بالکل صحیح ہے۔یہاں پر بنیادی نقطہ یہ ہے، اور اسے ہم بغیر کسی معذرت کے علی الاعلان کہتے ہیں کہ بنیادی طور پر اسلام کا مقصد ایک خوش حال اور متقی معاشرے کا قیام ہے۔خوش حالی بغیر تقویٰ کے (یا تقویٰ کی قیمت پر) اسلام کے لئے مکمل طور پر نا قابل قبول ہے اور ہم پکا یقین رکھتے ہیں کہ اسلام میں حلال و حرام کی پابندیاں معیشت کو ترقی کرنے سے ہرگز ہرگز باز نہیں رکھتیں بلکہ یہ تو ہر لحاظ سے خوش حالی حاصل کرنے میں مدد و معاون ثابت ہوتی ہیں۔

تبصرہ:

12.1۔اب میں اپنے قارئین کو یہ بتانا چاہتا ہوں بلکہ یہ بتانا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ میرے خیالات اس مضمون میں بیان کردہ خیالات سے کیوں مطابقت نہیں رکھتے۔اختلاف کی مفصل وجوہات تو سابقہ ابواب میں سے تلاش کی جاسکتی ہیں، تاہم میں یہاں پر بڑے اختصار کے ساتھ مسٹر رضوی کے مضمون میں بیان کردہ نقاط کے حوالے سے اپنے خیالات کا اعادہ کرنا چاہوں گا۔

12.2۔مسٹر رضوی کہتے ہیں کہ عربی لفظ ربا—یازیادہ مناسب طور پر الربا— انگریزی الفاظ Interest اور Usury دونوں کو محیط کئے ہوئے ہے؛ وہ مزید کہتے ہیں کہ قرآنی لفظ کا صرف Usury ترجمہ کرنا واضح اور صاف طور پر اسلامی قانون کو توڑنا مروڑنا ہے۔اس لئے مسٹر رضوی کی رائے میں نہ صرف غیر منصفانہ "Usury"(یعنی غیر منصفانہ طور پر زیادہ شرح سے سود)، بلکہ "Interest" بھی چاہے زیادہ یا کم جس شرح پر بھی لیا جائے قرآنی لفظ الربا کے دائرہ میں ہی آئے گا۔

12.3۔مسٹر رضوی اس بات کی بھی نشان دہی کرتے ہیں کہ بینکوں نے اپنی موجودہ صورت میں سترھویں صدی عیسوی سے کام کرنا شروع کیا۔یہی وہ بینک تھے جنہوں نے ساہوکاروں کے حد درجہ زیادہ شرح کے مقابلہ میں معتدل شرح سود متعارف کروائی۔ سترھویں صدی سے قبل نہ صرف انگلستان بلکہ ساری دنیا میں مشمولہ عرب انہیں ساہوکاروں کا سکہ چلتا تھا۔اور یہ کہ حضرت محمد ﷺ کے وقت میں سعودی عرب میں بھی یہی صورت حال پائی جاتی تھی جس کا اظہار سورہ اٰل عمران کی آیت نمبر 130 میں ہوتا ہے جہاں پر مؤمنین کو نصیحت کی گئی کہ وہ حد سے زیادہ (دوگنے اور چوگنے) منافع لینے میں اپنے آپ کو ملوث نہ کریں۔پس اب تک تمام ذرائع سے حاصل ہونے والی معلومات سے یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ قرآن کے زمانہ نزول میں حد سے زیادہ سود کا لیا جانا ایک عام دستور تھا۔پس لوگوں کو اس قسم کے غیر منصفانہ اور غاصبانہ منافعوں میں ملوث ہونے سے روکنے کے لئے الربا پر قرآنی حکم کا اطلاق کیا گیا۔اس کے باوجود مسٹر رضوی بڑے ہی دوٹوک الفاظ میں کہتے ہیں کہ اسلام Interest اور Usury میں کوئی تفریق برداشت نہیں کرتا اور Interest چاہے دس ہزار روپوں کے اوپر ایک پائی ہی کیوں نہ ہو مکمل طور پر حرام ہے۔آئیں ذرا دیکھیں کہ کیا یہ دوٹوک بیان قرآن سے ثابت ہے؟

12.4۔عربی میں ربو (ر-ب-و) کا مطلب بڑھنے یا اضافہ ہونے کے ہوتے ہیں اور ربا اس سے مشتق اسم ہے۔میرے پاس F. Steingass کی جو عربی انگلش لغات ہے اس میں ربا کے معنی Gain in Selling; Usury, Usurious Interest کے دیئے ہوئے ہیں۔ان معنوں سے Usury اور Usurious Interest کا ذکر تو ہے مگر صرف Interest کا ذکر نہیں ہے۔تاہم یہ

فرض کیا جاسکتا ہے کہ Gain in Selling کے لفظ میں Interest شامل ہو جاتا ہے کیونکہ Interest بہر حال ایک نفع ہی ہوتا ہے جو بینک قوت خرید یعنی رقوم (Money) کو بیچ کر حاصل کرتے ہیں۔ پس لغات کے مطابق تو ربا مختلف اقسام کے منافعوں کا مفہوم دیتا ہے۔ لیکن کیا قرآن تمام قسم کے منافع جات لینے سے منع کرتا ہے؟ یقیناً نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ "وَاَحَلَّ اللہُ الْبَیْعَ" (البقرہ:275)۔ اور اللہ نے بیع (تجارت یا کاروبار) کو حلال کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تجارت میں ایک معمول کا منافع جائز ہے۔ پس الربا کے قرآنی تصور کو سمجھنے کے لئے لغوی معنی دھوکہ دے سکتے ہیں۔ انسان کے اپنے بنائے ہوئے قوانین میں بھی جو الفاظ اور اصطلاحیں استعمال کی جاتی ہیں ان کے بارے میں بھی یہ خدشہ رہتا ہے کہ کہیں لغوی معنی دھوکہ نہ دے جائیں اس لئے قانون کے اندر ہی ان الفاظ اور اصطلاحوں کی تعریف کر دی جاتی ہے۔ قرآنی قانون الہامی ہونے کے حوالے سے ایک مکمل قانون بھی ہے اس لئے قرآن کے اندر ہی اس الربا کی تعریف اور تشریح ملنی چاہیئے جس کو حرام کیا گیا ہے۔ میری تمام جدید اسلامی محققین سے یہی شکایت ہے کہ وہ الربا کی تعریف بجائے قرآن میں تلاش کرنے کے اپنی خود ساختہ تعریف (الربا = سود) کی بڑی پابندی کے ساتھ اندھادھند پیروی کرتے ہیں، جبکہ اللہ تعالیٰ نے الربا کی الہامی تعریف سورہ الروم کی آیت نمبر 39 میں بیان کر دی ہے۔ یہ آیت کہتی ہے "وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِنْ رِبًا لِّیَرْبُوَا فِیْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ ـــــ" اور جو کچھ تم دیتے ہو بڑھنے کے واسطے، تاکہ یہ بڑھے لوگوں کے اموال (املاک، کمائیوں اور واجبات) میں سے۔ ہمیں بڑی احتیاط کے ساتھ اس بات پر دھیان دینا چاہیئے جو اللہ تعالیٰ اس آیت میں کہہ رہے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں 'وَمَآ اٰتَیْتُمْ اور جو کچھ تم دیتے ہو'۔ یہاں 'مَآ جو کچھ' سے مراد کچھ بھی ہو سکتا ہے، مثلاً: رقم (Money)، اور کوئی بھی دوسری مادی شے یا غیر مادی شے بھی جیسے مشورہ، خدمات وغیرہ۔ اگر کوئی شخص یہ اشیاء ان کے وصول کنندہ کو کسی معاوضے کا خیال کئے بغیر (چاہے یہ کسی صورت میں بھی ہو) دیتا ہے تو اسے زکوٰۃ یا خیرات کہا جائے گا۔ لیکن، بصورت دیگر، اللہ ان اشیاء کے دینے والوں کو بتاتا ہے "لَکُمْ رَءُوْسُ اَمْوَالِکُمْ" (البقرہ:279)، [تم اپنے اصلی اموال یعنی املاک، کمائیوں اور واجبات کے حق دار ہو]۔ اگر آپ کسی کمپنی کے مالیاتی مشیر ہوں تو آپ انہیں کوئی مادی شے نہیں دیتے، بلکہ اپنے خاص علم پر مبنی اپنی مشاورتی خدمات فراہم کرتے ہیں اور اسی لئے اس جائز معاوضے کے حق دار ہوتے ہیں جس کے لئے آپ نے وہ خدمات انجام دیں اور جن کی وجہ سے کمپنی کو فائدہ یا نفع ہوا۔ اگر آپ ایک ایسے کاروباری ہیں جو لوگوں کو کچھ مادی اشیاء فراہم کرتا ہے، تو آپ لوگوں سے صرف ان اشیاء کی لاگتی قیمت (Cost Price) ہی وصول نہیں کرتے جو آپ نے ان کو فراہم کیں، بلکہ اس کے ساتھ ان اشیاء کے فراہم کرنے کے سلسلے میں آپ نے جو خدمات سرانجام دیں، ان کے معاوضے کے طور پر ایک معقول اور مناسب منافع بھی ان سے وصول کرتے ہیں ۔ اور فرض کریں کہ آپ کچھ مکانات کے مالک ہیں اور آپ نے انہیں لوگوں کو ایک خاص عرصہ تک رہنے کے لئے دیا ہوا ہے۔ آپ لوگوں کو رہائش کی ایک لازمی ضرورت فراہم کرنے کے عوض کرایے کی ایک

مناسب اور معقول رقم وصول کرنے کے حق دار ہیں۔ اس کرایے میں مکانوں کی معمول کی توڑ پھوڑ کی مرمت پر آنے والے اخراجات بھی شامل ہونگے۔ جب آپ ایک معقول اور جائز شرح سے ایسے کرایے، منافع یا معاوضے وصول کرتے ہیں تو آپ اپنے جائز واجبات ہی وصول کر رہے ہوتے ہوتے ہیں دوسروں کے نہیں۔ اس وقت آپ اپنے اصلی اموال (رَءُوۡسُ اَمۡوَالِکُمۡ) کی حدود کے اندر ہوتے ہیں۔ اور جب آپ رَءُوۡسُ اَمۡوَالِکُمۡ کی ایسی قرآنی حدود سے باہر چلے جاتے ہیں اور ناجائز اور غیر منصفانہ طریقوں سے لوگوں کی املاک، کمائیوں اور واجبات ہڑپ کر کے اپنے آپ کو مالا مال کرنے کی کوشش کرتے ہو تو پھر آپ ممنوعہ اور حرام الربا کی حدود میں داخل ہو جاتے ہیں۔

12.5۔ اوپر دئے گئے پیراگراف کی مثالوں میں فرض کریں، واجبات، جائز اور منصفانہ معاوضہ، منافع یا کرایہ رقم کی 100 اکائیوں کے برابر ہے، اور آپ 200 اکائیاں وصول کرتے ہیں، تب آپ الربا میں ملوث ہونے کے مرتکب ہونگے۔ دوسری طرف اگر آپ کو صرف 50 اکائیاں لینے پر مجبور کیا جائے گا، تو پھر اس معاملے کی دوسری پارٹی الربا لینے کی مجرم ٹھہرے گی۔ تب یہ محولہ بالا الروم کی آیت نمبر 39 کی واضح تشریح ہو گی کیونکہ الربا اس آیت کی روشنی میں وہ غیر منصفانہ منافع یا فائدہ ہوتا ہے جو دوسروں کے جائز واجبات، کمائیاں یا املاک ہڑپ کر کے حاصل کئے جاتے ہیں۔ ہمیشہ جب بھی الربا ملوث ہو گا تو کوئی نہ کوئی ناانصافی کا عنصر شامل ہو رہا ہو گا۔ اس کی تصدیق سورہ النساء کی آیت نمبر 161 [وَّ اَخۡذِهِمُ الرِّبٰوا وَ قَدۡ نُهُوۡا عَنۡهُ وَ اَكۡلِهِمۡ اَمۡوَالَ النَّاسِ بِالۡبَاطِلِ] سے بھی ہوتی ہے جہاں پر کہا گیا ہے کہ الربا لینے والے دوسروں کے اموال باطل (غاصبانہ) طریقے سے ہڑپ کرتے ہیں۔ مجھے یہ کہنے دیجئے کہ صرف یہ ناانصافی کا عنصر ہی ہوتا ہے جو الربا کے سارے معاملات میں ہمیشہ شامل ہوتا ہے۔

12.6۔ اب آئیں کامل دیانت داری سے اس بات کا جائزہ لیں کہ آیا جو رقوم اچھی شہرت کے مالک بینک قرضے میں دیتے ہیں ان میں کوئی ناانصافی کا عنصر شامل ہوتا بھی ہے یا کہ نہیں۔ سود کی رقم کا ایک بڑا حصہ بینک کے اخراجات ہوتے ہیں، جن کا مطالبہ کرنا کسی بھی لحاظ سے الربا کے قرآنی قانون کی رو سے حرام قرار نہیں دیا جا سکتا۔ سود کی رقم کے بقیہ حصے کو، جو عموماً قرضے پر دی ہوئی کل رقم کا 3٪ ہوتا ہے بینک کا جائز اور منصفانہ منافع کہا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ پچھلے ابواب میں پہلے بتایا جا چکا ہے، بینکنگ باقی کاروباروں کی طرح ایک کاروبار ہے۔ اور قرآن کہتا ہے کہ "وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الۡبَيۡعَ" (البقرہ:275)، اللہ نے کاروبار کو حلال کیا ہے۔ جائز اور معقول منافع لے کر وہ اپنے واجبات (اموال) کا مطالبہ کر رہا ہوتا ہے۔ یہ دوسروں کے اموال کا ہڑپ کرنا نہیں ہوتا۔ اس میں کوئی ناانصافی بھی نہیں ہوتی۔ قرآن کی اصطلاح میں یہ الربا نہیں ہے۔ پھر ہم جان بوجھ کر کیوں ایک نہایت ہی تشویشناک گناہ کا ارتکاب کر رہے ہیں: یعنی قرآن کی رو سے اسے حرام کہہ رہے ہیں جو حرام نہیں ہے۔ ہمیں بڑی سنجیدگی سے اس سبب پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیئے جس کی وجہ سے قرآن میں الربا لینے والوں کو شیطان کے جادو کے زیر اثر (يَتَخَبَّطُهُ الشَّيۡطٰنُ) کہا گیا ہے: 'ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ قَالُوۡۤا اِنَّمَا

الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا'(البقرہ:275)یہ اس وجہ سے ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ کاروبار الربا کی مانند ہے۔یہ نہیں کہا گیا کہ کاروبار الربا کی مانند ہے۔اور کیا ہم بھی یہی نہیں کہہ رہے کہ (بینکنگ کا)کاروبار الربا کی مانند ہے؟اللہ ہمیں سچائی کو دیکھنے والی فہم عطا فرمائے تا کہ ہم اس تشویشناک گناہ میں مبتلا ہونے سے بچ جائیں۔

13۔ضمیمہ ب: اقبال احمد خان سہیل کی کتاب ?What is Riba پر ایک تبصرہ

13.1۔ کتاب کے پانچویں حصہ کے دوسرے پیراگراف میں، مصنف کہتے ہیں کہ شریعت نے بڑھوتری یعنی نفع کی ایک خاص قسم (تمام اقسام نہیں) کو حرام کیا ہے۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ خود قرآن پاک میں نہ تو اس خاص قسم کا کہیں کوئی واضح ذکر ملتا ہے اور نہ ہی ربا کے لفظ کی کوئی واضح تعریف۔

13.2۔ دوسرے الفاظ میں، مصنف کے اپنے خیال کے مطابق، آسمانی کتاب خود اپنے اس حکم کے بارے میں واضح نہیں ہے جو اس نے اپنے ماننے والوں کو دیا! وہ انہیں ربا یا الربا (جس کا قرآن میں ذکر ہے) کی سخت ممانعت تو کرتی ہے لیکن یہ اس بارے میں کہ ربا کیا ہوتا ہے خود واضح نہیں ہے۔

13.3۔ اگر ہم یہ بات صحیح مان لیں تو یہ حکم، اس کتاب کو آسمانی کتاب ماننے والوں کے لئے ایک ایسا بہت ہی انتہائی اور غیر معمولی بیان بن جاتا ہے جس پر یقین نہیں کیا جا سکتا، اور خاص طور پر اس وقت جب خود اللہ تعالیٰ اسی کتاب میں ہی فرما رہے ہوں کہ "۔۔۔ اُنْظُرْ کَیْفَ نُبَیِّنُ لَھُمُ الْاٰیٰتِ۔۔۔"(المائدہ:75)۔ دیکھو کیسے کھول کھول کر بیان کرتے ہیں ہم ان کے سامنے پیغامات۔ یہ سچ ہے کہ اس کتاب میں کچھ پیغامات (متشابھات) تمثیلی نوعیت کے ہیں اور جن کے معانی ہم انسانوں کے لئے زیادہ واضح نہیں ہیں اور یہ سب واضح ہو بھی نہیں سکتے کیونکہ اس مادی دنیا میں ہمیں ان کیفیات سے واسطہ پڑتا ہی نہیں ہے جن کا ان پیغامات میں ذکر ہوتا ہے مثلاً جہنم کی آگ کا جلا دینے والا تصور یا بہشتی زندگی میں میسر آنے والی آسائشات کا احساس۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ جن پیغامات میں حلال اور حرام جیسے احکامات دیئے گئے ہوں ان کو اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر بیان نہ کیا ہو؟ کیا اس کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے کہ جن احکامات کا تعلق ہماری نجات سے ہو جیسا کہ الربا کے بارے میں احکامات ان کو ہم تمثیلی (متشابھات) پیغامات کا نام دے دیں۔ یہ تو وہ آسمانی ضابطے ہیں جن پر عمل کرنے کے ہم سب انسان پابند ہیں۔ اور ہم ان ضابطوں پر عمل کرنے کے کیسے پابند ہو سکتے ہیں جو غیر واضح ہوں۔ اس لئے الربا کے بارے میں قرآنی آیات کو واضح اور صاف ہونا چاہیئے جن کو قرآن محکمات کہہ کر پکارتا ہے (اٰل عمران:7)۔

13.4۔ اس لئے جو شخص بھی قرآن پاک پر ایمان رکھتا ہے وہ مصنف کے اس متنازعہ بیان کو فوراً رد کر دے گا کہ یہ آسمانی کتاب الربا کی اصطلاح کے بارے میں غیر واضح ہے۔ الربا کی جو تعریف مصنف نے وضع کی ہے وہ اس کی زیر تبصرہ کتاب کے حصہ 42 میں اس کے اپنے غلط قیاس پر مبنی ہے، اس لئے یہ تعریف ناقص ہے۔

13.5۔ یہ (مصنف کی الربا کے بارے میں تعریف) زیادہ تر - بلکہ تقریباً کلی طور پر الربا کے اس ایک خاص واقعہ پر انحصار کرتی ہے جس کا ذکر پیغمبر ﷺ کے خطبہ حج الوداع میں ملتا ہے۔ پیغمبر ﷺ نے اس خطبہ میں الربا کی اصطلاح کی وضاحت نہیں کی تھی۔ بلکہ اس سلسلے میں انہوں نے یہ کہہ کر کہ "میں اپنے چچا حضرت عباس کا جو کچھ بھی الربا کی مد میں واجب الادا ہے اسے معاف کرتا ہوں"، آسمانی ضابطے کے ساتھ اپنی وابستگی کی صرف ایک ذاتی مثال قائم کی تھی۔ حضرت عباس کی الربا کے بارے لین دین کی تفصیلات کا وہاں ذکر نہیں کیا تھا۔ نہ ہی ان تفصیلات کا ذکر قرآن پاک میں ہے۔ مصنف کو ان تفصیلات کے لئے ظاہر ہے ان روایات (احادیث) پر ہی انحصار کرنا پڑا جو پیغمبر ﷺ کے اس دنیا سے دو سو سال سے زیادہ عرصہ گذرنے کے بعد ورطہ تحریر میں لایا گیا۔ اس درمیانی دو سو سال سے زائد عرصہ کے دوران یہ واقعات (روایات) ایک نسل سے دوسری نسل تک زبانی ہی بیان ہوتے رہے۔

13.6۔ اس منظر نامے کے تناظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے، ہم مصنف کی وضع کردہ الربا کی تعریف کے پیچھے پوشیدہ منطق کا جائزہ لینے کی کوشش کریں گے۔ وہ منطق سوائے ان سطروں کے کچھ نظر نہیں آتی۔ "اس علیم و خبیر خالق، پروردگار عالم اور ہادی برحق نے قرآن پاک میں الربا کے خلاف ایک ایسا سخت حکم نامہ جاری کیا جس کے بارے میں کوئی واضح تعریف اس میں نہیں دی گئی۔ اس (اللہ) نے یہ بھی مناسب نہیں سمجھا کہ ان واقعات کا تذکرہ ہی کر دیا جاتا جو اس حکم نامے کا سبب بنے۔ اور یہ چودہ صدیاں بعد پیدا ہونے والے، زیر تبصرہ کتاب کے مصنف پر چھوڑ دیا گیا کہ وہ الربا کی تعریف کو ان واقعات سے اخذ کرے جو ان لوگوں کی شہادت پر ریکارڈ کئے گئے تھے جو اس وقت وہاں پر موجود ہی نہیں تھے۔ اور ان لوگوں کو، جو ان چودہ صدیوں کے دوران پیدا ہوئے اور وفات پا گئے، صرف حالت بیچارگی میں چھوڑ دیا گیا کہ وہ الربا کی اصل حقیقت کو نہ جان پائیں کیونکہ مصنف خود کہتے ہیں کہ وقتاً فوقتاً فقہانے جو تعریفیں پیش کیں وہ سب غلط تھیں"

13.7۔ مصنف کی یہ منطقی حماقت اتنی بدیہی ہے کہ اس پر مزید کسی تبصرے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تو کہنے میں اس حد تک بھی جاؤں گا کہ کسی کا یہ کہنا کہ اللہ نے اپنی محکم آیات (محکمات) کو مبہم چھوڑ دیا ہے، ایک بدعت ہے۔ لیکن زمینی حقائق کیا ہیں؟ قرآن کی کون سی آیت یا آیات الربا کی یہ تعریف یا معنی بتاتی ہیں؟ ایک مکتبہ فکر تو وہ ہے جو کہتا ہے کہ قرآن الربا جیسی اصطلاحوں (جو اس نے استعمال کی ہیں) کی تعریف بیان نہیں کرتا۔ اس مکتبہ فکر کے مطابق، قرآن نے ان اصطلاحوں کے وہی معنی لئے ہیں جو عرب میں نزول کے وقت مروج تھے اور اس وقت الربا کے معنی سود کے علاوہ کچھ نہیں تھے، جیسا کہ آج بھی ہم اس کے معنی سود ہی کرتے ہیں۔ مصنف نے اپنی زیر تبصرہ کتاب میں سود اور الربا کی درمیانی مساوات پر ایک سیر حاصل بحث کی ہے۔ انہوں نے اس مساوات کی نامعقولیت اور نادرستگی کو جو ایک پر تحسین انداز میں بے نقاب کیا ہے میں اس نقطہ پر مکمل طور پر ان سے

متفق ہوں۔ اب ہمیں قرآن کی طرف واپس لوٹنا چاہیئے تاکہ ہم یہ معلوم کر سکیں کہ اللہ کی الربا سے در حقیقت کیا مراد ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب تمہارے درمیان کسی معاملے پر تنازعہ پیدا ہوجائے تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹادو (النساء:59)۔

13.8۔ اور یہ مکمل طور پر ایک ناقابل تصور بات ہے کہ جو شخص یہ کام (اللہ اور اس کے رسول کو حکم بنانا) بڑے اخلاص کے ساتھ کرتا ہے اللہ اسے مایوس کرے۔ وہ ہمارا سب سے بڑا اور بہتر رہنما ہے اور اس مقصد کے لئے اس نے ہمیں ایک اچھوتی، غیر آلودہ اور غیر متبدل کتاب، قرآن سے نوازا ہوا ہے جس میں قیامت تک آنے والی ساری نسلوں کے لئے ہدایت کے سامان مہیا کر دیئے گئے ہیں۔ اور یہ بات یقینی ہے کہ اس کی ہمارے ادراک سے ماوراحکمت و بصیرت نے ہمارے سارے تنازعات کے حل اس کتاب کے اندر رکھ دیئے ہیں۔ خاص طور پر الربا کی تعریف کے سلسلے میں ہمارے تنازعہ کا حل الربا پر ترتیب نزولی کے اعتبار سے پہلی ہی آیت میں دے دیا گیا ہے۔ یہ آیت سورہ الروم کی 39 ویں آیت ہے جس میں ارشاد ہوتا ہے "وَمَا اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّیَرْبُوَا فِیْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرْبُوْا عِنْدَاللّٰہِ ـــــ" (الروم:39)۔ اور جو کچھ بھی تم نفع پر دیتے ہو تاکہ یہ (جو تم نے دیا) بڑھے لوگوں کے اموال (ان کی جائز املاک، کمائیوں یا حقوق) میں سے، ایسا منافع یا اضافہ اللہ کے ہاں اضافہ نہیں ہے ـــــ۔

13.9۔ عربی میں ربا کے لغوی معنی اضافے یا منافعے کے ہوتے ہیں۔ محولہ بالا آیت یہ بتلا رہی ہے کہ جو اضافہ یا منافع اللہ تعالیٰ پسند نہیں فرمارہے وہ صرف ایک خاص قسم ۔ تمام اقسام نہیں ـــ کا ہے۔ وہ خاص قسم کا اضافہ یا منافع وہ ہے جو دوسرے لوگوں کی املاک، کمائیاں یا واجبات ہڑپ کر کے حاصل کئے جاتے ہیں۔ اسی خاص قسم کے ربا کو بعد میں نازل ہونے والی تمام آیات میں الربا کہا گیا ہے (یعنی وہ ربا جس کا سورہ الروم کی آیت نمبر 39 ذکر کیا گیا ہے)۔ پس اسی خاص ربا کو سورہ البقرہ کی آیت نمبر 275 میں حرام یعنی منع کیا گیا ہے۔

13.10۔ اس لئے یہ صاف طور پر ظاہر ہے کہ سورہ الروم کی آیت نمبر 39 کا جملہ "وَمَا اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّیَرْبُوَا فِیْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرْبُوْا عِنْدَاللّٰہِ ـــــ" ہی اس الربا کی تعریف کر رہا ہے جس کو سورہ البقرہ کی آیت نمبر 275 میں حرام قرار دیا گیا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب کا مصنف بھی حقیقتاً یہی کہہ رہا ہے کہ جس ربا کو قرآن حرام قرار دیتا ہے وہ ربا کی ایک خاص قسم ہے۔ لیکن بد قسمتی سے ان کی نظر سورہ الروم کی آیت نمبر 39 میں دی گئی غیر مبہم اور واضح تعریف پر نہیں پڑ سکی۔

13.11۔ پس ممنوعہ الربا کا قرآنی تصور مختصر طور پر ان الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے: "الربا وہ غیر منصفانہ اضافہ یا منافع ہے جو ایک شخص لین دین کے دوران دوسرے لوگوں کی جائز املاک، کمائیاں یا واجبات ہڑپ کرکے حاصل کرتا ہے "اس لئے ربا کے خلاف قرآن پاک کے اس حکم کا مقصد معاشرے سے لین دین کی تمام اقسام کی ناانصافیوں کا خاتمہ کرنا ہے۔ اس کا اطلاق آفاقی ہے، یہ صرف دارالسلام تک ہی محدود نہیں ہے اور نہ ہی اس کی وسعت کو کم کیا جاسکتا ہے جیسا کہ زیر تبصرہ کتاب کے مصنف نے خود اپنی وضع کردہ تعریف کی رو سے کیا ہے جو ان کی کتاب کے حصہ 42 میں دی گئی ہے۔ انسان کی خود ساختہ تعریف آسمانی تعریف کی روشنی میں محل نظر نہیں ہوسکتی۔ الربا یا حرام ربا کا قرآنی تصور اسلامی معاشیات کا ایک بنیادی اصول ہے۔ کسی بھی قوم کی معیشت جب اس اصول کی پیروی کرے گی تو وہ مضبوط اور محرک معیشت بن کر ابھرے گی۔

13.12۔ آخر میں اس بات کا اعادہ کیا جاتا ہے کہ اگرچہ زیر تبصرہ کتاب کافی سارے مفید اور مضبوط نقاط پر مشتمل ہے، خصوصًا الربا کو سود کے مترادف قرار دینے والے فرضی افسانے کو باطل ثابت کرنے کے حوالے سے، مصنف کی الربا کی اپنی وضع کردہ تعریف مندرجہ ذیل وجوہات کی بنا پر غلط ثابت ہوتی ہے۔

- یہ کہنا گستاخانہ مفروضہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی محکم آیات (محکمات) کو مبہم اور سمجھنے کے لئے مشکل بنایا ہے۔
- مصنف سورہ الروم کی آیت نمبر 39 میں ممنوعہ الربا کی آسمانی تعریف پر غور کرنے میں ناکام رہا۔
- مذکورہ آسمانی تعریف کے ہوتے ہوئے مصنف کی خود وضع کردہ تعریف کے باقی رہنے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔
- آسمانی تعریف کے مقابلے میں یہ تعریف بہت ہی محدود اور امتیازی نوعیت کی ہے۔ ان وجوہات کی بناہ پر اس کا مزید جائزہ لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی بقا ممکن ہی نہیں ہے۔

14۔ضمیمہ ج: جدید اسلامی بینکاری نظام کی اختراع پر ایک تبصرہ

14.1۔جدید اسلامی نظام بینکاری بیسویں صدی کی آخری دہائیوں کی پیداوار ہے۔'اسلامی' کے نام سے ہمیں اس دھوکے میں نہیں پڑنا چاہیئے کہ اس کو قرآن وسنہ کی ایسی یقینی تائید حاصل ہے کہ جس پر کوئی انگلی نہ اٹھائی جاسکتی ہو۔ہمارے علماء کی اکثریت نے یہ فرض کیاہوا ہے کہ اسلام میں سود حرام ہے اور اسی مفروضے کی بنیاد پر اس جدید نظام بینکاری کو ایجاد کیا گیااور طرفہ تماشہ یہ کہ جو علماء کرام سود کو حرام سمجھتے ہیں ان میں سے بھی اکثر اس جدید اسلامی نظام بینکاری کے خلاف ہیں۔تاہم کچھ علماء ایسے بھی ہیں جو سود کو بذاتہٖ حرام نہیں سمجھتے۔یہ زندگی کی ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ لازمی نہیں اکثریت ہمیشہ حق پر ہو اور اقلیت ہمیشہ باطل پر ہی ہو۔یہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جولازمی طور پر ہمیشہ حق پر ہوتی ہے۔اسی لئے حق کی تلاش کے لئے ہمیں اس کی کتاب ہدایت یعنی قرآن پاک کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے اور زیر نظر معاملے کے حل کے لئے بھی اب ہم اسی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔اللہ فرماتا ہے "۔۔۔فَاِنۡ تَنَازَعۡتُمۡ فِیۡ شَیۡءٍ فَرُدُّوۡہُ اِلَی اللّٰہِ وَ الرَّسُوۡلِ اِنۡ کُنۡتُمۡ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ۔۔۔" (النساء: 59)۔ پھر اگر جھگڑا ہو جائے تمہارے درمیان کسی معاملہ میں، تو پھیر دو اسے (فیصلے کے لئے) اللہ کی طرف اور رسول کی طرف اگر تم (واقعی) ایمان رکھتے ہو اللہ پر اور روز آخرت پر۔

14.2۔جس کو قرآن میں حرام کیا گیاہے وہ درحقیقت الربا ہے۔عربی میں اس اصطلاح کے لغوی معنی بڑھوتری، نفع، اضافہ، فائدہ، بیشی، وصولی یا حاصل کے ہوتے ہیں۔لیکن ہمارے موجودہ دور کے اکثر مسلم علماء اس بات پر مصر ہیں کہ اس اصطلاح کا مترادف اردو میں سوائے سود اور انگریزی میں سوائے Interest کے اور کچھ نہیں ہے۔اور وہ یہ اس لئے کہتے ہیں کہ ان کی بدھی یعنی علمی معلومات کے مطابق نزول قرآن کے وقت یہ اصطلاح انہی معنوں میں استعمال ہوتی تھی۔ انہوں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ آج اس اصطلاح کے جو موجودہ لغوی معنی وہ لیتے ہیں قرآن نے بھی اس وقت اس کے وہی معنی لئے تھے۔ان کا خیال ہے کہ قرآن نے اس اصطلاح کی کوئی تعریف (Definition) متعین ہی نہیں کی۔لیکن جب ایسی تشریحات کی جاتی ہیں تو یہ علماء اس حقیقت کو یکسر فراموش کر دیتے ہیں کہ قرآن صرف ان لوگوں کے لئے نازل نہیں ہوا تھا جو نزول کے وقت موجود تھے بلکہ یہ ایک ایسی آسمانی کتاب ہے جو قیامت تک آنے والے سارے انسانوں کے لئے اپنے اندر ہدایت لئے ہوئے ہے۔وہ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ اس کتاب کا مصنف مستقبل میں ہونے والی تمام تبدیلیوں سے بخوبی آگاہ تھا اور اس نے ان تبدیلیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کتاب کے اندر ایسی ضروری اور مناسب دفعات رکھ دی تھیں جو اس کے احکامات کو آنے والے سارے زمانوں میں واضح کرتی رہیں گی۔وہ قرآن پاک میں بار بار دہرائی جانے والی اس آسمانی یقین دہانی کو بھی بھول جاتے ہیں جس میں کہا گیا ہے "اللہ اپنی آیات کو واضح طور

پر بیان کرتا ہے"۔ پس ہمارے ان علماء کی تشریحات میں بدعت کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے اس لئے ہمیں فوراً کتاب اللہ کی طرف رجوع کرنا چاہیئے تا کہ وہاں سے یہ معلوم کیا جاسکے کہ اس نے الربا کی آیات کو کس طرح واضح کیا ہے۔

14.3۔ جیسا کہ ہم ابھی دیکھیں گے کہ قرآن ربا کی فعلی صورت ربو (ر۔ب۔و) کا استعمال کرتا ہے جس کے معنی اضافہ ہونے یا نفع حاصل کرنے کے ہوتے ہیں اور کسی بھی عالم کا ان معنوں کے بارے میں اختلاف نہیں ہے۔ پس علماء کو کم از کم اس بات پر تو متفق ہونا چاہیئے کہ لغوی طور پر ہی سہی، کہ ربا، اضافہ یا نفع کے معنی دیتا ہے۔ اس پر بھی سبھی کا اتفاق ہونا چاہیئے کہ ربا کے حرام کرنے سے اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہر قسم کے اضافہ یا نفع کو حرام کرنے کا ہر گز نہیں تھا۔ کوئی اس بات کو کیسے تسلیم کر سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان تمام قسم کے اضافوں اور منافعوں کو حرام قرار دے دے جو لوگ مختلف کاروبار ہائے زندگی میں اپنی جائز کوششوں کو صرف کر کے اور انسانیت کو اپنی نفع بخش خدمات بہم پہنچا کر حاصل کریں۔ اللہ تعالیٰ نے تو ایسے تمام اضافوں او منافعوں کو تقدیس کا درجہ عطا فرما دیا جب اس نے قرآن پاک میں خصوصی طور فرمایا کہ "ـــــ وَاَحَلَّ اللہُ الْبَیْعَ ـــ" (البقرہ:275)۔ اور اللہ نے کاروبار (بیع) کو حلال کیا ہے۔ پس ان اضافوں اور منافعوں (جن کو اللہ نے حلال کیا ہے) کے علاوہ ان کی کوئی خاص قسم ہی ہونی چاہیے جن کو حرام کیا گیا ہے۔ قرآن ان خاص قسم کے اضافوں اور منافعوں کی تصدیق الربا کے لفظ سے کر رہا ہے جو اوپر محولہ بالہ جملہ میں آگے چل کر "وَحَرَّمَ الرِّبٰوا" سے ظاہر ہے یعنی اس نے ربا سے پہلے ال لگا کر اضافوں اور منافعوں کی اس خاص قسم الربا کے حرام ہونے کی طرف اشارہ کر دیا ہے جس کا اس سلسلہ میں سب سے پہلے نازل ہونے والی سورہ الروم کی آیت نمبر 39 میں ذکر کر دیا گیا ہے۔

14.4۔ سورہ الروم کی آیت نمبر 39 اس موضوع پر سب سے پہلے نازل ہونے والی آیت ہے۔ اور وہاں یقینی طور پر اضافہ یا منافع کی ایک خاص قسم کا ذکر ہمیں ملتا ہے! "وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِنْ رِّبًا لِّیَرْبُوْا فِیْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرْبُوْا عِنْدَاللہِ ـــــ" اور جو دیتے ہو تم بڑھنے (اضافہ یا منافع حاصل کرنے) کے لئے تا کہ اضافہ ہو اس کا یا بڑھے وہ لوگوں کے اموال میں، پس یہ اللہ کے ہاں نہیں بڑھتا۔ گویا اس خاص قسم سے مراد، اضافہ یا نفع کی وہ قسم ہے جو ان اموال (املاک، کمائیوں اور واجبات) میں سے حاصل کی جائے، جو اس کی اپنی نہ ہوں بلکہ دوسرے لوگوں کی ہوں (اس آیت میں فعل ربو پر ذرا غور فرمائیں جو بڑھنے یا اضافہ ہونے کے معنی دے رہا ہے)۔ جب ایک دوکاندار کسی شے کو اس کی قیمت کے بدلے بیچتا ہے تو اس قیمت میں اس کا اپنا ایک معقول منافع بھی شامل ہوتا ہے۔ یہ منافع اس کا اپنا مال (حق) ہوتا ہے جو اس نے اس شے کے حصول اور اسے گاہک کو آسانی سے بر وقت مہیا کرنے کے سلسلے میں اپنی خدمات ادا کر کے جائز طریقے سے کمایا ہوتا ہے۔ اسی لئے تو قرآن کہتا ہے کہ "اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے ـــ" لیکن اگر وہی دوکاندار، کسی صورت حال کا فائدہ اٹھا کر، معقولیت کی حدود کو پار کر جائے اور اپنے لئے ناجائز منافع کمانے کی غرض سے زیادہ قیمت وصول کرنا شروع کر دے تو اس کا یہ عمل اپنے مال میں سے نہیں بلکہ اپنے گاہکوں کے اموال میں سے زائد منافع نکالنے کا عمل کہلائے گا۔ ایسی

صورت میں وہ اس قسم کا ربا لینے کا مرتکب ہو رہا ہو گا جسے محولہ بالا آیت میں بیان کیا گیا ہے۔ اور اسی ربا (کی قسم) کو ال لگا کر سورہ البقرہ کی آیت نمبر 275 میں خصوصی طور پر ممتاز کر کے حرام کر دیا گیا۔ اب ذرا غور فرمائیں کہ "اللہ تعالیٰ اپنی آیتیں کس طرح کھول کھول کر واضح طور پر بیان کرتا ہے۔"

14.5۔ اب یہ بات تو بالکل بلور کی طرح سے صاف ہو چکی کہ جس الربا کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے قرآن مجید میں بڑے غیر مبہم انداز میں اس کی وضاحت اور تعریف کر دی گئی ہے۔ یہ وہ غیر منصفانہ اضافہ یا منافع ہے جس کے لئے کسی بھی لین دین کے دوران ایک شخص بڑی سلیقہ مندی اور ہوشیاری کے ساتھ دوسرے اشخاص سے ان کی جائز املاک، کمائیاں اور ان کے واجبات کو ہڑپ کرنے کے جتن کرتا ہے۔ پس یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ قرآن نے الربا کی اصطلاح کی وضاحت اور تعریف نہیں کی اور اسی لئے اس الہامی کتاب کے نزول کے وقت جو اس اصطلاح کے معانی مروج تھے وہی اپنا لئے گئے۔ سود یا Bank Interest کے بارے میں شکوک و شبہات پھیلانے کی کئی وجوہات نظر آتی ہیں۔ سود یا Interest اپنی ذات کے اعتبار سے، حرام (ممنوعہ) الربا کی الہامی تعریف میں تو کسی صورت نہیں آتا۔ جب کوئی اچھی شہرت کا مالک بینک رقم سود پر ادھار دیتا ہے، اس سود کا زیادہ حصہ تو ان متناسب اخراجات پر مشتمل ہوتا ہے جو بینک رقم ادھار دینے کے سلسلہ میں برداشت کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک تھوڑا سا منافع کا مارجن بینک اپنے لئے بھی رکھتا ہے۔ جو اخراجات بینک برداشت کرتا ہے وہ بینک کے اپنے اموال ہی ہوتے ہیں اور اسی طرح ایک معقول منافع کا مارجن بھی بینک کا اپنا مال ہوتا ہے جو وہ اپنے گاہکوں کو ان کے جائز اور قانونی کاروبار کے لئے قوت خرید مہیا کر کے بجا طور پر بطور اپنے حق کے کماتا ہے۔ جب بینک اپنے ایسے جائز اموال کو سود کی صورت میں وصول کر رہا ہوتا ہے تو ایسا کر کے وہ اس الربا کے گناہ کا ارتکاب نہیں کرتا جس کی تعریف سورہ الروم کی آیت نمبر 39 میں کی گئی ہے۔ ہاں البتہ بینک اس صورت میں اس گناہ کا مرتکب ہو گا جب اس کے منافع کا مارجن معقولیت کی حدود کو پار کر جائے گا۔

14.6۔ پس مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ کس طرح سے حرام الربا اور سود کے درمیان مساوات قائم کر کے ایک فریب پیدا کر دیا گیا ہے۔ اور قرآن کی واضح ہدایات کے باوجود ہمارے علماء کا اس مساوات پر اصرار ان کے اس فریب کو گناہ سے بھرپور ایک سفید جھوٹ میں تبدیل کر رہا ہے۔ نام نہاد اسلامی بینکاری کی ساری کی ساری عمارت اس جھوٹی بنیاد پر ہی تعمیر کی گئی ہے۔

14.7۔ اور حرام الربا کو سود کے مترادف قرار دینے والے غلط واہمے کو معقول بنانے کے لئے یہ الزام بھی لگایا جاتا ہے کہ سود پر مبنی لین دین میں (جس میں سود کی شرح متعین ہوتی ہے) ادھار دینے والا کوئی خطرہ مول نہیں لیتا اس لئے سودی کاروبار غیر اسلامی ہے۔ یہ الزام معاشیات کے بنیادی اسلامی اصول کو غلط طور پر سمجھنے کی وجہ سے لگایا جاتا ہے۔ یہ بنیادی اصول قرآن میں یہ کہہ کر

بیان کر دیا گیا ہے "وَ اَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا" اور اللہ نے کاروبار (البیع) کو حلال کیا ہے اور الربا کو حرام۔ ہم اوپر بحث کے دوران اس اصول کی تشریح ایک دوکاندار کی مثال سے بھی کر چکے ہیں۔ البیع کے ذریعے سے جو فائدہ یا منافع ہم حاصل کرتے ہیں وہ ہمارا اپنا مال ہوتا ہے، جبکہ الربا کے ذریعے سے حاصل کردہ فائدہ یا نفع ہمارا اپنا مال نہیں ہوتا بلکہ یہ دوسروں کا مال ہوتا ہے جو غیر منصفانہ طریقہ سے ہم ہڑپ کرتے ہیں۔ اس لئے البیع کو حلال کیا گیا ہے اور الربا کو حرام۔ وہ سودی رقوم جو بینک اپنے قرضداروں سے وصول کرتا ہے اور جو بینک ہی کا مال ہوتا ہے انہیں متعین ہی ہونا چاہیئے کیونکہ ان کی نوعیت متعین ہی ہوتی ہے، مثلاً عمارات کے کرایے، ملازمین کی تنخواہیں اور دیگر اخراجات جو سود کی رقم میں شامل ہوتے ہیں سب وقت کے حوالے سے متعین ہی ہوتے ہیں۔ اس لئے اس اعتراض میں کہ سود متعین ہوتا ہے کوئی جان ہی نہیں ہے۔ سود کی شرحیں بدلتی رہتی ہیں لیکن بدلتے ہوئے حالات کے مطابق۔

14.8۔ کسی فرد یا ادارے کی طرح بینک بھی اپنے اموال لینے کے حق دار ہیں۔ اس میں کوئی بات بھی تو غیر اسلامی نہیں ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ "ـــــلَکُمْ رَءُوْسُ اَمْوَالِکُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَ لَا تُظْلَمُوْنَ" (البقرہ:279)۔ـــــتمہارے لئے تمہارے اصل (یعنی تمہارے اپنے، دوسروں کے نہیں) اموال ہیں: تم بھی ظلم نہ کروگے اور تم پر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ اگر بینکوں کو ان کے جائز اور قانونی اخراجات اور منافعے حاصل کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی جو ان کے اپنے اموال ہیں، (البتہ جو سود کے نام سے وصول کئے جاتے ہیں) تو ان کے اوپر ظلم ہوگا، اور اللہ اس کو بھی منع کرتا ہے۔ قرآنی قانون میں ایسی کوئی ذمہ داری عائد نہیں کی گئی ہے جو بینک کی جائز اور قانونی کمائی کو بینک سے ادھار لینے والوں کی جائز اور قانونی کمائیوں کے درمیان ایک رشتہ یا تناسب قائم کرتی ہو اور بینک کو اس بات کا پابند بناتی ہو کہ وہ اپنے قرضداروں کے کاروباری خطرات میں حصہ دار بنیں۔ تاہم قرآن یہ بات ضرور کہتا ہے کہ اگر قرض دار وقت پر قرض کی ادئیگی کے قابل نہ ہوں تو ان کو ادائیگی میں مزید مہلت دی جائے۔ اگر قرض دار دیوالیہ ہو جائے تو الہامی قانون، قرض دینے والے کو قرض کی معافی کی گنجائش پیدا کرنے کے لئے بھی کہتا ہے (البقرہ:280)۔ یہی کچھ اچھے بینک کرتے ہیں اور جو بینک مسلمان چلائیں ان کو بھی یہی کچھ کرنا چاہیئے۔ بینکوں کو اتنا ظالم نہیں ہونے دیا جاسکتا کہ وہ اپنی رقوم واپس نکلوانے کے لئے قرض داروں کو اتنا قلاش کر دیں کہ وہ اپنی زندگی کی بنیادی ضروریات خوراک، لباس اور رہائش سے ہی محروم ہو جائیں۔ یہ کہنا بھی کہ بینکنگ کے کاروبار میں کوئی خطرہ (Risk) ہوتا ہی نہیں ایک ایسی بات ہے جس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ دنیا میں کوئی بھی انسانی سرگرمی کبھی بھی ایسی نہیں ہوسکتی جو مکمل طور پر خطرے سے خالی (Risk Free) ہو۔

14.9۔ لیکن سورہ البقرہ کی آیت نمبر 280 اسی سورہ کی آیت نمبر 279 کی نفی نہیں کرتی۔ حاجت مندوں کے لئے خیرات کی ضرورت ان بنیادی حقوق کو کالعدم نہیں کرسکتی جو اللہ تعالیٰ نے ایک فرد یا ادارے کو اپنی جائز املاک، کمائیوں اور واجبات کے سلسلے

میں عطا کئے ہیں۔ اس لئے بینکوں کو اس بات پر مجبور کرنا غلط ہوگا کہ وہ قرض لینے والے کاروباروں کے منافعوں یا نقصانات میں سے ایک متناسب حصہ لیں اور وہ اپنے جائز واجبات وصول کرنے کے مدعی نہ بنیں۔ لیکن ابھی تک تو اسلامی بینکاری کے حامی یہی کچھ کرتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔ وہ بینکوں کو ان کا وہ حق دینے سے یک سر منحرف ہیں جو اللہ نے انہیں بخشا ہے۔

14.10۔ مالیات کی فراہمی کا یہ متبادل طریقہ کار جو مشارکہ (سرمایہ میں شراکت) کہلاتا ہے ایک زیادہ قابل عمل طریقہ نہیں ہے۔ بینکوں کا اپنی مرضی سے رضاکارانہ طور پر نفع و نقصان کی بنیاد پر کسی مستحکم کمپنی کے حصص خرید لینا ایک جدا بات ہے، لیکن ان بینکوں کو (اور سارے بینکوں کو) اس بات پر مجبور کرنا کہ وہ ان تمام قسمت آزما کاروباروں (جو ان سے قرضہ لیتے ہیں) کے ساتھ شراکت کے معاملات طے کریں بالکل دوسری بات۔ یہ بہت ہی خطرناک معاملہ ہے؛ کیونکہ اگر قرضے اس (نفع نقصان میں شراکت کی) بنیاد پر دیئے جائیں گے، بغیر اس بات کی یقین دہانی کئے کہ جن کاروباروں کو قرضہ دیا جارہا ہے وہ نفع بخش ہیں بھی کہ نہیں، تو بینکوں کی بربادی جلدی ہی ان کا مقدر ہوگی۔ اور اگر ان کی نفع بخشی کی یقین دہانی کی جائے گی تو اس مقصد کے لئے انہیں ان تمام کاروباروں کے ماہرین کی خدمات حاصل کرنا پڑیں گی جن کاروباروں سے ان کے قرضہ لینے والے منسلک ہیں۔ پہلے تو انہیں قرضہ حاصل کرنے والوں کی درخواستوں کی بڑی سختی کے ساتھ جانچ پڑتال کرنا ہوگی اور پھر قرض حاصل کرنے والے کاروباروں کے انتظامی معاملات کی مناسب نگرانی بھی کرنی پڑے گی۔ اس صورت میں بینک صرف بینک نہیں رہیں گے، بلکہ وہ ایسے کاروباری مجموعوں (Business Complexes) میں تبدیل ہوجائیں گے جو بینکنگ کے علاوہ اور دوسرے مختلف کاروبار بھی چلارہے ہونگے۔ تب بینکوں کو محاورے کی زبان میں ہر فن مولا کہا جائے گا لیکن اندیشہ یہی رہے گا کہ وہ کسی ایک فن کے بھی ماہر نہیں ہونگے۔ اسی اندیشے کے احساس (Perception) اور ممکنہ خطرات کی وسعت نے اسلامی بینکوں کو بھی مشارکہ کے اس مالیاتی طریق کار سے مشکوک اور بدظن کر دیا ہے اور اسی لئے اب وہ دوسرے مشتبہ طریقوں کی طرف مائل ہوتے نظر آرہے ہیں۔

14.11۔ مشارکہ کے مالیاتی طریقے کا ایک اور متبادل جو مضاربہ کہلاتا ہے، بھی قابل غور ہے۔ یہ ایک مہم جویانہ کاروبار میں شراکتی سرمایہ کاری (Venture Capital Equity Investment) ہوتی ہے۔ یہ ان کاروباری ناظمین، سائنسدانوں اور انجینئرز کو مالیات فراہم کرنے کا ایک بہترین طریقہ ہے جو امید افزا منصوبوں کے بارے میں روشن تصورات (Bright Ideas) تو رکھتے ہوں لیکن ان منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے اور ان کے فوائد کو عام کرنے کے لئے ان کے پاس سرمایہ نہ ہو۔ اس طریقہ کے مطابق، پہلے ایک فرم یا کمپنی بنائی جاتی ہے اور پھر اس کے لئے ایک فنڈ تخلیق کیا جاتا ہے جسے Venture Capital کہا جاتا ہے۔ یہ فنڈ خصوصی طور پر ایسے ہی منصوبوں کے لئے سرمایہ فراہم کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اگر کاروبار کامیاب ہو جائے تو منافع جات کو مالیات فراہم کرنے والوں اور منصوبے کو نافذ کرنے والے کاروباری ناظمین کے درمیان تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ اگر یہ ناکام

ہو جائے تو مالیات فراہم کرنے والوں کو مالی نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے اور منصوبے کے نافذ کرنے والوں کو اپنی محنت اور ان کاوشوں سے ہاتھ دھونا پڑتے ہیں جو انہوں نے اس سلسلے میں اٹھائی ہوتی ہیں۔ ایسی Venture Funds رکھنے والی کمپنیاں امریکہ میں تو کامیاب رہی ہیں جن سے کاروباری ناظمین (جیسے انفارمیشن ٹیکنالوجی کے شعبہ سے منسلک پیشہ ورماہرین) کو فائدہ بھی پہنچا ہے اور وہ اپنی شاندار کامیابی کو ثابت کرنے میں کامیاب رہے۔ بدقسمتی سے اسلامی دنیا نے اس فراہمی مالیات کے طریقہ کے سلسلے میں کوئی ایسی سرگرمی نہیں دکھائی اگرچہ وہی اپنے آپ کو اس کی سب سے بڑی چیمپئن سمجھتی ہے۔ لیکن اس طریقہ کو تمام بینک، طریق واحد کے طور پر اختیار نہیں کرسکتے۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو وہ فنڈز جن پر بینکوں کو اختیار حاصل ہوتا ہے عوام الناس کی اکثریت اور اس کے مختلف شعبوں کو اس طرح سے مہیا نہیں ہوسکیں گے جس طرح کہ وہ آج کل ہوتے ہیں۔ مزید براں کاروباری ناظمین کے منصوبوں کی منافع بخشی کو جانچنے کے لئے خصوصی مہارت کی ضرورت بھی پیش آئے گی ورنہ تو مالیات فراہم کرنے والوں کی بربادی ہی بربادی ہوگی۔ اس طرح سے مالیات کی فراہمی لازمی طور پر ایک بہت ہی خصوصی مہارت والا کام بن جائے گا جس کو ایک عام بینک سرانجام دینے سے قاصر رہے گا۔ یہ کام صرف ایک ایسی کمپنی ہی کرسکتی ہے جو خصوصی طور پر اس مقصد کے لئے بنائی گئی ہو۔ بینک اس قسم کے معاملات سے نپٹنے کے لئے زیادہ سے زیادہ ایک الگ شعبہ قائم کرسکتے ہیں۔

14.12۔ اگرچہ نظریاتی اعتبار سے اسلامی بینکوں کی طرف سے فراہمی سرمایہ کے لئے مذکورہ بالا دونوں طریقے، سود کے متبادل کے طور پر بڑے اہم اور مرکزی تصور کئے جاتے ہیں، تاہم عملی طور پر ان بینکوں نے ان دونوں طریقوں کی بجائے ایک دوسرے آسان اور سہل طریقہ کو ترجیح دی ہے جس میں خطرات کم سے کم پائے جاتے ہیں۔ [اس طریقے سے انہوں دوسرے تجارتی بینکوں کے بارے میں اپنے 'ہم تم سے زیادہ پارسا ہیں' ('holier-than-thou') والے رویے کی خود ہی تکذیب کردی ہے۔] یہ کم خطرے والا طریقہ جسے انہوں نے چنا ہے **مرابحہ** کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ 'خریدنے اور بیچنے' یا تجارت کرنے کے دوسرے نام کے سوا کچھ نہیں ہے۔ بینک اس چیز کو خرید لیتا ہے جو اس کے گاہک کو درکار ہوتی ہے اور پھر وہ اس چیز کو، اس کی قیمت میں مارک اپ شامل کرکے فروخت کردیتا ہے۔ ہاں بینک کی طرف سے اپنے گاہک کے لئے یہ ایک سچی خدمت ہوسکتی ہے، اگر بینک بازار میں دستیاب بہترین چیز مسابقتی قیمتوں پر خریدے اور پھر اسے وہ اپنے گاہک کو اس کی دہلیز پر مہیا کردے۔ ایسا نہیں کیا جاتا اور ایسا کیا بھی نہیں جاسکتا بشرطیکہ بینک کے پاس ایسا کرنے کے لئے مناسب بنیادی ڈھانچہ موجود ہو۔ یہ توقع رکھنا کہ بینکوں کے پاس واقعی اس قسم کا بنیادی ڈھانچہ موجود ہوگا ایک امر محال ہے۔

14.13۔ عملی طور پر اسلامی بینک جو کرتے ہیں اس کا نام '**بیع معجل**' کا طریقہ فراہمی مالیات ہے۔ اس طریقہ کے مطابق شے یا جائداد جو بھی گاہک کو چاہیئے ہوتی ہے اس کو بینک خرید لیتا ہے اور پھر زیادہ قیمت پر ادھار قسطوں میں وہ گاہک کو بیچ دی جاتی

ہے۔ ظاہر ہے اس قسم کا لین دین اسی وقت ہوتا ہے جب گاہک کے پاس اس شے یا جائداد کو براہ راست بازار سے خریدنے کے لئے معقول رقم نہیں ہوتی۔ ایک روائتی بینک اپنے گاہک کو شے یا جائداد کی بجائے نقد رقم دیتا اور اس پر سود وصول کرتا۔ پس **بیع معجل** کی صورت میں گاہک سود کی بجائے قیمت کا فرق ادا کرتا ہے۔ اس کے لئے تو یہ صرف نام سے پکارے جانے (Nomenclature) کا ہی فرق ہے۔ پس اس معاملے کی تلخ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی بینک بھی زائد رقم وصول کرتے ہیں مگر اس کو وہ سود نہیں کہتے بلکہ مارک اپ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ پیچیدہ راستہ انہوں نے صرف اس لئے اختیار کیا ہے کہ ان پر سود خوری کا الزام نہ لگ سکے جس کو غلطی سے الربا کے مترادف سمجھ لیا گیا ہے جو اسلام میں حرام ہے۔ ہم نے اوپر دیکھ لیا ہے کہ الربا= سود کا نظریہ کتنا گمراہ کن ہے۔

14.14۔ اسلامی بینکوں کے واسطے سے ایک دعویٰ اکثر سننے میں آتا ہے کہ اسلامی بینک اپنے حریف روائتی بینکوں کے مقابلہ میں زیادہ منافع حاصل کرتے ہیں۔ اس کا مطلب تو یہی بنتا ہے کہ جو قیمت کا فرق اول الذکر بینک وصول کرتے ہیں وہ شرح میں اس سود سے زیادہ ہے جو موخر الذکر بینک وصول کرتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ ایسا اس لئے ممکن ہوتا ہو کہ اول الذکر اپنے قرض داروں کے جائز اموال ہڑپ کر کے اپنے حق سے زیادہ وصول کر رہے ہوں۔ اپنے روائتی حریفوں پر مسابقتی رجحان ان کو الربا کے اسی گناہ میں مبتلا نہ کر دے جس سے پیچھا چھڑانے کے لئے انہوں نے یہ پاپڑ بیلے تھے۔

14.15۔ اسلامی بینک مالیات کی فراہمی کے **اجارہ** (قسط وار خریداری) اور **بیع سلم** (ادھار پر خریداری) جیسے دوسرے طریقے بھی اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ لیکن ایسے تمام طریقوں کی وجہ جواز ایک ہی ہے۔ اسلامی بینک جب اس طرح کے مختلف طریقے اختیار کرتے ہیں، تو وہ اس بات سے بے خبر ہوتے ہیں کہ الربا کے قرآنی حکم نے اس فرق کے لینے پر ایک حد مقرر کر دی ہے جو دو قیمتوں (یعنی نقد اور ادھار) میں ہوتا ہے۔ اگر وہ اس سلسلے میں اپنے جائز اموال کی حدود سے باہر جا کر اپنے قرض داروں کے اموال کو ہڑپ کرنا شروع کر دیں تو وہ اپنے آپ کو حرام اور ممنوعہ الربا میں ملوث ہونے کا مجرم بنالیں گے۔ اور تب اگر ایسے اسلامی بینک ان روائتی بینکوں پر جو اپنے اموال کی حدود کے اندر رہتے ہوئے سود وصول کرتے ہیں، الربا میں ملوث ہونے کا الزام لگائیں گے، تو ایسے اسلامی بینکوں کے منیجر "ان الربا لینے والوں کی مانند ہونگے جن کا برتاؤ ان لوگوں کی طرح کا ہو گا جن کو شیطان نے چھو لیا ہو۔ اور یہ اس لئے کہ وہ کہتے ہیں (بینکنگ کا) کاروبار الربا کی مانند ہے۔ اور اللہ نے کاروبار کو حلال اور الربا کو حرام کیا ہے" اللہ ہم سب کو شیطان کے اثر سے بچائے۔

14.16۔ مجھے بڑی تکلیف کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ مندرجہ ذیل وجوہات کہ بنا پر اسلامی بینک اسلامی مقاصد کو پورا کرنے سے بہت دور ہیں۔

- ان بینکوں کا جواز اس غلط یقین پر مبنی ہے کہ اسلام میں برائے خود سود کی ممانعت ہے۔
- یہ غلط یقین اس بدعتی سوچ کا نتیجہ ہے جو شیطان نے ہمارے اندر پھونک دی ہے کہ اللہ نے اپنی قرآنی آیات کو ممنوعہ الربا کے بارے میں واضح، صاف اور غیر مبہم نہیں بنایا۔
- قرآن نے سورہ الروم کی آیت نمبر 39 میں ممنوعہ الربا کی تعریف بڑے واضح، صاف اور غیر مبہم انداز میں بیان کر دی ہے۔
- قرآنی تعریف برائے خود سود کو شامل نہیں کرتی جب تک کہ یہ غیر منصفانہ طریقہ سے نہ لیا جائے۔
- قرآنی تعریف اپنے دائرہ کار میں، ممنوعہ الربا=سود کی سادہ مساوات (جو غلط اور بہت محدود ہے) کی نسبت زیادہ وسیع ہے۔
- اسلامی بینک لفظ 'سود' سے بے جا طور پر اس خبط میں مبتلا ہیں کہ جو بینک اپنے جائز واجبات سود کے نام سے وصول کرتے ہیں انہیں بھی وہ حرام گردانتے ہیں۔
- یہ بینک اس حقیقی ممنوعہ الربا کے بارے میں بالکل بے خبر ہیں جس کو شیطان نے چپکے سے ان کے اپنے معاملات میں ان کے اپنے عقبی دروازوں سے داخل کر دیا ہے۔

15۔ضمیمہ د: حدیث کی پرکھ کیلئے اقبال احمد سہیل کی کتاب "What is Riba?" سے اخذ کردہ چند اصول

15.1۔ تمام محدثین رحمتہ اللہ علیہم اجمعین نے احادیث کو روایت کرنے کے لئے نہایت سخت محنت اور جانفشانی سے کام لے کر فن روایت کے بہت سارے اصول اور طریقے متعین فرمائے۔ انہوں نے تقریباً ہر راوی کے بارے میں یہ ذکر کیا ہے کہ وہ کتنا مستند ہے، اس کی ذہنی حالت کیا ہے، کن کن سے اس نے روایت کیا ہے، اس کے معاصرین کون کون تھے اور ان کی روایات، روایت کے کس معیار پر پوری اترتی ہیں۔ انہوں نے فن روایت اور راویوں کی سیرت واحوال پر ایک بڑا قابل قدر ذخیرہ جمع کیا ہے۔ تاہم محدثین انسان تھے اور غلطی کا صدور ان سے ہو سکتا تھا۔ یہ عین ممکن ہے کہ کچھ مستند احادیث، ان کے چھان بین اور فیصلہ کرنے کے ناقدانہ معیار پر پوری نہ اتری ہوں، اس لئے وہ احادیث آج ہمارے پاس موجود ہی نہ ہوں یا اگر ہوں تو ضعیف اور موضوع احادیث کی صورت میں ہوں۔ اسی طرح یہ بھی عین ممکن ہے کہ جس راوی کو محدثین نے مستند اور اچھی یادداشت کا مالک سمجھا ہو، حقیقتاً وہ ایسا نہ ہو۔ یا اچھی یادداشت کا مالک ہونے کے باوجود اس نے ایک غلط بات روایت کر دی ہو اور وہ غلط روایت مستند روایات کے اندر شامل کر لی گئی ہو۔

15.2۔ بہت سی روایات اصلی الفاظ یا اقتباسات کی بجائے مستخرجات (Derivations) پر مشتمل ہیں۔ پس یہ روایات حضرت محمد ﷺ کے اپنے اصل الفاظ میں روایت نہیں کی گئیں بلکہ راوی نے جو کچھ معنی حضور ﷺ کے الفاظ کے سمجھے اس نے وہ اپنی قابلیت اور صلاحیت کے مطابق پوری خلوص نیت کے ساتھ حدیث رسول ﷺ کے حوالے سے اپنے الفاظ میں بیان کر دیئے۔ اب ہر کوئی جانتا ہے کہ الفاظ تو ایک طرف، بیان کرنے والے کے لہجہ میں ایک معمولی سی تبدیلی بھی معانی کے اندر بہت فرق پیدا کر سکتی ہے۔

3.15۔ بعض اوقات حضور ﷺ نے دو مختلف موقعوں پر دو مختلف ہدایات دیں اور دونوں میں کافی الفاظ مشترک تھے تاہم ان کی نوعیت مختلف تھی۔ لیکن راوی نے غلطی سے ایک ہدایت کے الفاظ دوسری ہدایت کے الفاظ کے ساتھ گڈ مڈ (Mix up) کر دیئے۔ اس طرح سے اصلی روایت میں ذرا سی تبدیلی نے معنی کو مکمل طور پر بدل کر رکھ دیا۔

15.4۔ بعض اوقات پاک پیغمبر ﷺ نے ایک مختصر سی ہدایت دی اور اس کی کوئی وجہ نہیں بتائی۔ اب سننے والے نے اپنی ذہنی صلاحیت کے مطابق اس ہدایت کے لئے 'وجہ' خود ہی تخلیق کر ڈالی۔ جب یہ روایت آگے بڑھی راوی کا اضافہ اصلی حدیث کا حصہ

بن گیا۔ تب روایت کے پھیلاؤ کی بنیاد پر کچھ معزز صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم یا بعد میں آنے والے تابعین نے اپنی سمجھ کے مطابق بعض معاملات میں فتویٰ جاری کر دیا اور کچھ عرصہ کے بعد یہی فتویٰ حدیث کا حصہ بن گیا۔ پس دیکھیں کہ چیزیں بعض اوقات کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہیں اور کس طرح ان کے اصلی معنوں میں تبدیلی آجاتی ہے۔ جب فقہا کو یہ روایت اتنی تبدیلیوں کے بعد ملی تو انہوں نے منطقی طور پر بال کی کھال ادھیڑنا شروع کر دی لیکن انہوں نے روایت کی صحت کے بارے میں تحقیق نہیں کی تاکہ اس میں جو اضافہ ہو گیا تھا اسے صاف کیا جا سکے۔

15.5۔ بعض اوقات ہمیں کوئی روایت نہایت ہی غیر معقول اور مکمل طور پر قرآنی متن یا پاک پیغمبر ﷺ کی عظمت اور اونچی شان کے خلاف ملتی ہے۔ اس قسم کی روایات تو کسی صورت بھی قابل قبول نہیں ہونی چاہئیں چاہے ان کے راوی کتنے ہی مستند کیوں نہ ہوں۔ بجائے ان کو رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کرنے کے مناسب ہو گا کہ ان کو روایوں کی غلطی اور غلط فہمی پر محمول کیا جائے، بہر حال وہ انسان ہی تو تھے چاہے وہ پاکیزگی میں کتنا ہی اونچا مقام کیوں نہ رکھتے ہوں۔ ان کی طرف سے غلطی اور غلط فہمی کے امکان کو ہر گز رد نہیں کیا جا سکتا کیونکہ تمام اہل سنت کا اس پر اتفاق ہے کہ معصومیت صرف پیغمبروں کا ایک خصوصی اعجاز ہے۔ راویوں کی معصومیت کا عقیدہ شریعت کا حکم نہیں ہے۔ اور ہمارے عقیدہ کے مطابق یہ بالکل ناممکنات میں سے ہے کہ پاک پیغمبر کا کوئی حکم غیر معقول اور قرآنی روح اور اس کے الفاظ کے خلاف ہو۔ مزید یہ کہ پاکیزگی اور پارسائی کے اوصاف، معاملہ فہمی اور معانی و مفہوم کو دوسروں تک پہچانے کی صلاحیت سے بالکل جدا اور مختلف اوصاف ہیں اور لازمی نہیں ہے کہ یہ تمام اوصاف ایک ہی شخص میں پائے جائیں۔ لیکن اس سب کے باوجود حیرت کی بات یہ ہے کہ راویوں کے الفاظ اور محدثین کی تحقیق میں غلطی کو غلطی مانا ہی نہیں جاتا، چاہے یہ روائتیں آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ قرآن کی آیات سے بھی متصادم کیوں نہ ہوں، چاہے ایسی روایات قبول کرنے سے اسلام کی صحیح روح کتنی ہی مجروح کیوں نہ ہوتی ہو اور اس پر کتنے ہی ناروا اعتراضات وارد کیوں نہ ہوتے ہوں اور سب سے بڑھ کر چاہے اکابر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم ایسی رویات کو رد ہی کیوں نہ کر چکے ہوں۔

15.6۔ مثال کے طور پر ہم جانتے ہیں کہ جب حضرت ابو ہریرہ نے یہ روایت کی کہ جب میت کے گھر والے روتے ہیں تو اس کا عذاب میت کو دیا جاتا ہے، تو ام المؤمنین حضرے عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے انہیں نصیحت کی اور یاد دہانی کروائی کہ اللہ نے خود قرآن پاک میں فرمایا ہے "— وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی" (الانعام:164) اور نہیں اٹھاتا کوئی بوجھ اٹھانے والا بوجھ دوسرے کا۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ لواحقین کے رونے سے مرنے والے کو عذاب ہو، یعنی گناہ کا ارتکاب کرنے والوں کی بجائے عذاب کسی اور کو دیا جائے؟ اس لئے یہ نبی کریم ﷺ کی حدیث نہیں ہو سکتی۔ اصل میں ہوتا یہ ہے کہ جب مرنے والے کے لواحقین جدائی میں روتے ہیں تو مرنے والا اپنے اعمال کے نتائج سے نبرد آزما ہو رہا ہوتا ہے۔ یہی حقیقت تھی جس کا حضرت محمد ﷺ نے ذکر

کیا تھا۔ ایک غلط فہمی کی وجہ سے راوی نے رونے اور عذاب کے درمیان ایک علت اور معلول کا رشتہ قائم کر لیا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور بہت سے دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے ایسے بہت سارے واقعات کا ذکر فرمایا ہے۔ اب فرض کریں کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جو مسلم خواتین میں فقہ میں ایک بلند مقام رکھتی ہیں وہ وہاں پر موجود نہ ہوتیں اور روایت پر کوئی اعتراض نہ اٹھایا جاتا تو یہ اسلام کے چہرے پر کتنا بڑا دھبہ ہوتا! اس قسم کے واقعات کے بیان کا مقصد احادیث کو مشکوک بنانا اور اس کے نتیجہ میں ان کو یک سر رد کرنا نہیں ہے۔ ہم ہرگز اس بات سے غافل نہیں ہیں کہ اس طرح ہم ایک ایسے بیش بہا خزانے سے محروم ہو جائیں گے جس کو محدثین نے اپنی قابل تحسین اور بیش بہا کوششوں سے جمع کیا تھا جس کا بہت بڑا حصہ حضرت محمد ﷺ کی درست احادیث پر مشتمل ہے اور جو ہمارے ایمان کا جز ہے۔ مقصد صرف یہ ہے کہ ہمیں کچھ عجیب اور حیران کن روایات کو بطور مستند احادیث کے قبول کرنے میں ذرا محتاط ہونا ہو گا۔ ہمیں صرف اصول روایت کو ہی نہیں بلکہ اوپر بیان کردہ امکانات کو بھی مد نظر رکھنا ہو گا۔ ایک ہی موضوع پر مختلف روایات کو اکٹھا کر کے ان کا معنی اور سیاق و سباق کے حوالے سے موازنہ کرنا ہو گا اور پھر ان کو قرآنی آیات، ایمان اور حکمت کی کسوٹیوں پر بھی پرکھنا ہو گا۔ اگر کوئی روایت ان معیاروں پر پوری اترتی ہے تو پھر اس کے وجوب پر کون شک کر سکتا ہے؟